پیش کش

اردو فکشن ڈاٹ کام

ریت کا ماضی

انجم قدوائی

عرض داشت

گو کہ میرا تعلق ایک زمیندار خاندان سے ہے مگر میں نے تقسیمِ ملک کے بعد کی زمینداری میں آنکھیں کھولیں۔ ایک عرصہ تک گاؤں اور دیہات کا ماحول نظروں کے سامنے رہا جس کے نقوش آج بھی باقی ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ عرصے تک بیرونِ ملک رہنے کے بعد بھی وہ ماحول میرے ذہن سے محو نہ ہوسکا اس لیے میرے کئی افسانوں میں وہ نظر آتا ہے۔

میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کیں مگر لکھنے کا شوق ہائی اسکول سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ افسانے شائع ہوئے تو حوصلہ بڑا اور پھر یہ شوق زیادہ سر چڑھ گیا۔ زندگی کی حقیقتوں کو دیکھا، سوچا اور جتنا تحریر کرسکتی تھی کیا۔ زندگی کو الفاظ میں ڈھالنے کا فن کتنا آتا ہے یہ تو ناقدین طے کریں گے تخلیق کار کا کام تو بس تخلیق کرنا ہے۔

'ریت کا ماضی' میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے امید ہے کہ پسند آئے گا۔

انجم قدوائی

فہرست

اللہ کے نام پر

بڑا سا کچا صحن، دونوں طرف بڑے بڑے دالان تیسری طرف ڈیوڑھی اور چوتھی طرف باورچی خانہ کا برمداہ بڑی دیر سے برامدے کی زمین پر بیٹھی لائینیں کھینچ رہی تھی،

میں نے مڑکر دیکھا پتہ نہیں کس سوچ میں تھی

۔کیا ہوا خلیقن ‘‘میں نے آہستہ سے اسے آواز دی وہ ایک دم چونک کر اٹھی اور جھاڑو دینے لگی۔

کچھ نہیں بٹیا۔‘‘اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کچھ ہے ضرور

کچھ تو ہوا ہے بتاؤ مجھے۔‘‘میں نے اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا۔اور کتاب بند کر دی وہ آ کر میرے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔‘‘ٹھیک سے بیٹھو پٹڑی لے لو۔‘‘میں نے لکڑی کی پٹڑی کی طرف اشارہ کیا۔‘‘ کا ٹھیک سے بیٹھیں بیٹا۔۔ابا تو پگلائے گئے ہیں۔‘‘وہ جھنجھلائی۔

کیا بک رہی ہو اتنے اچھے تو ابا ہیں تمہارے کتنا خیال رکھتے ہیں۔‘‘بیچارے تمہیں کھانا تک تو پکا کر کھلاتے ہیں۔‘‘

‘‘ارے تو کا بھوا۔۔ہم ہو کبھی کبھی پکائے لیت ہیں۔کون بڑا کام کرت ہیں (ارے تو کیا ہوا ہم بھی

تو کبھی کبھی پکا لیتے ہیں کون سا بڑا کام کرتے ہیں)

''تم تو بہت بری ہو اتنے اچھے ابّا کو ایسے بولتے ہیں کہیں؟؟''

''اچھے وچھے ناہیں او......تم کا تو کچھ پتہ نہیں ہے ۔او ہمرا بیاہ ٹھکوائے دیئیں ہیں (انھوں نے ہماری شادی طے کردی ہے)''یہ تو خوشی کی خبر ہے بھئی ۔لاؤ مٹھائی وٹھائی کھلاؤ۔۔''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔کاہے کی مٹھائی ۔ہم نہ کرہئے بیاہ۔سلیمن کا کروائے دیں''

'سلیمن تو چھوٹی ہے ابھی ۔۔چلو اچھا کام ختم کرو' میں نے اپنی کتاب پھر سے اٹھالی مگر بات یہاں ختم نہیں ہوئی ۔اس کی شادی واقعی طے ہوگئی تھی ۔اسی جمعہ کو بارات آرہی تھی ۔گاؤں میں گھما گہمی سی ہوگئی،لاؤڈ اسپیکر پرگانے شروع ہوگئے ۔گاؤں کی لڑکیاں اپنے رکھے رکھائے رنگ برنگے اچھے کپڑے پہن کر پورے گاؤں میں گھومتی پھریں۔۔۔رات کوشادی کا کھانا بھی آیا سمیع بابو کے گھر سے ۔

کافی دھوم دھام سے خلیق کی شادی ہوگئی اور وہ خوب زور زور سے روتی ہوئی رخصت ہوئی وہ لوگ اسے ٹریکٹر کی ٹرالی میں رخصت کرواکے گئے ۔میں

نے اس کے لیئے چند جوڑے کپڑے اور ایک چاندی کا سیٹ بھجوایا۔۔۔وہ میرے گھر پر بچپن سے ہی کام کرتی تھی ۔ پہلے پہل اپنی امّاں کی انگلی تھامے ہوئے ڈری سہمی آتی اور ایک کونے میں بیٹھی انھیں کام کرتے دیکھتی رہتی ۔کچھ برس ہوئے اس کی امّاں کا انتقال ہوگیا تو وہ اکیلی آنے لگی اس نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔کبھی کبھی وہ اپنی چھوٹی بہن کو بھی لے آتی اور وہ اسی طرح ایک کونے میں بیٹھی رہتی ۔خلیق کچھ کھانے کی چیز اس کے سامنے رکھ دیتی اور خود کام میں لگی رہتی مجھے بھی اس کی عادت سی ہوگئی تھی ۔گھر پر بابا،بھیّا اور میں تھی ۔کام زیادہ نہ تھا۔مگر اتنے بڑے گھر کی صفائی اور کچّے آنگن کی جھاڑو میں ہی ایک گھنٹہ لگ جاتا اور دوسرے تب ہمارے گھر میں گیس کا

چولھا بھی نہیں تھا، لکڑی جلا کر ہی کھانا بنتا۔۔۔کھانے کی تعداد کا بھی کچھ پتہ نہیں کبھی کئی لوگ کھانے پرآ جاتے اور وہ جلدی جلدی سارا انتظام مہارت سے کر لیتی۔میں چند ماہ پہلے ہی ہوسٹل سے گھر لوٹی تھی یہاں کے کاموں کی عادت بھی نہیں تھی۔۔ ہر وقت خلیقن کی ضرورت رہتی تھی۔۔۔اس نے گھر احسن طریقے سے سنبھالا ہوا تھا۔اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا، دال بہت مزے کی پکاتی ،ترئی گوشت تو لاجواب ہوتا تھا اس کے ہاتھ کا۔۔بیسن کی روٹی لہسن کی چٹنی جب اصلی گھی میں تل کر لاتی تو میں اور بھیّا کئی روٹیاں صاف کر جاتے اور پھر خوب ہنستے۔۔۔ کیونکہ خلیق دوبارہ آٹا گوندھ رہی ہوتی، دوبارہ چٹنی بگھار رہی ہوتی اور خود بھی ہمارے ساتھ ہنستی رہتی۔۔۔۔۔اس کے ماتھے پر کبھی کوئی بل نہیں آتا کہ وہ گرمی میں دوبارہ سارا کام کر رہی ہے۔۔ ۔اس کے جاتے ہی سمیع بابو نے دوسری عورت کا انتظام کر دیا تھا اور سروری نے کام سنبھال بھی لیا تھا۔۔مگر خلیق والی بات کہاں سے آتی؟؟ مجھے تو ہر وقت اسے آواز دینے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔۔۔ ہر کھانے میں ہم خلیق کے ہاتھ کا مزا ڈھونڈتے رہ جاتے۔۔مگر۔۔۔ جمعہ کو اس کی شادی ہوئی اور اتوار کو وہ منہ پھلانے میرے سامنے بیٹھی تھی۔

''اب کیا ہوا۔۔۔''؟ میں نے ہنستے ہنستے اسے گلے سے لگا لیا۔مگر وہ تو واقعی خفا تھی ''بول۔۔کیا ہوا۔۔؟ کیسا ہے تیرا میاں؟''

''ارے کیسا ہے؟؟؟ بہت کھر اب منئی ہے او۔۔''

'اب کیا ہوا تجھے۔۔۔؟''اس کے انداز پر مجھے بہت ہنسی آئی

''ٹرانسسٹر لائے ہیں گھر ماں۔۔۔''

''ہاں تو کیا ہوا؟ ٹرانسٹر کوئی بری چیز ہے کیا؟ مزے سے گانے سننا۔۔۔تم کو تو گانے سننا پسند ہے نا۔؟''

''ہاں تو پسند ہے تو ای کون بات ہے۔۔کہ گھر تو ٹوٹا پھرٹا۔ دروجّا تک ان کا جرانہیں پھر کالاگ ہے۔کوُکرٹ (کتّا) آوت جات ہے اور گھر مالے آیئں ٹرانسسٹر۔۔'' (ہاں پسند تو ہے مگر یہ کیا بات ہوئی کہ گھر تو ٹوٹا ہوا ہے دروازہ تک نہیں ہے بانس لگے ہیں، کتّا آتا جاتا ہے اور گھر میں لے آئے ٹرانسسٹر)'

'ارے تو تو بڑی سمجھدار ہوگئی ہے۔۔مطلب یہ کہ پہلے گھر کا دروازہ بنوانا چاہیئے پھر کوئی تفریح کی چیز لانی چاہیئے، ہان بھئی بات تو صحیح ہے چلو ہم بات کرینگے تمہارے میاں سے۔۔۔''

'' کاہے کے میاں۔۔؟ بٹیا۔۔ہم کا ای آدمی ٹھیک ناہی لگت ہے۔۔۔'' وہ بدک کر بولی۔۔۔

'' کیوں؟؟ کیا ہوا؟''

''اب بٹیا تمکا کا بتایئں۔۔'' وہ شرما گئی''

کیوں،، بتاؤ۔۔سب کچھ تو بتاتی ہو اپنے ابّا سے پٹ کر آتی تھیں تب بھی اور اپنے معصوم ابّا کو پیٹ کر آتی تھیں تب بھی کہ ''مرہیئں تو مارو کھیئہیں۔۔کاہے مارن ہمکا'' (مارینگے تو مار بھی کھائینگے ۔۔ہم کو کیوں مارا) اتنا سمجھایا کہ ابّا پر ہاتھ نہیں اٹھاتے مگر تم تو کہتی تھین کہ ''مرہیں تو جرور ئے مریئے'' (وہ مارینگے تو ہم بھی مارینگے) اب کیا ہوا جو نہیں بتا سکتیں؟'' میں خاموش ہوگئی اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اس کی آنکھیں آنسوں سے بھری تھیں

۔''بٹیا۔۔۔او ہمکا پکڑت ہے'' اس نے اٹک اٹک کر بتایا

۔''ارے تو وہ تیرا مرد ہے پاگل۔۔۔کوئی غیر تھوڑی ہے'' مجھے بھی شرم آ گئی۔''مرد ہے تو کا بھوا ۔۔۔ہمکا پکڑ ہیئے تو ایسن مار کھیہیئے'' (مرد ہے تو کیا وہوا۔ ہم کو پکڑے گا تو ایسے ہی مار کھائے گا)

''ہایئں۔۔؟؟ تم اسے مار کے آئی ہو کیا غضب کرتی ہو تم پاگل ہو بالکل۔۔'

'''ہاں ہاں ہم تو پاگل ہیئی ہیں بتائے دیہو ابّا کا۔۔۔کہ ہم نا جابئے، ہمکا پکڑت ہے، ہمکا نیک

نہیں لگت دور سے بات کرئے تو ٹھیک ہے نہیں تو مار مار کے دھن دیب'' (ہم تو پاگل ہیں ہی۔ابّا کو بتا دینا کہ ہم جایئنگے نہیں، بات کرنی ہے تو دور سے کرے ورنہ بہت مارینگے ہم)'' وہ زور زور سے جھاڑ و دے کر دھول اڑانے لگی گویا اپنا غصّہ نکال رہی ہو

۔''یا اللہ کیا مصیبت ہے یہ لڑکی'' میں نے سر پیٹ لیا۔سمیع بابو کا شمار گاؤں کے شریف اور غریب کسانوں میں سے تھا۔ان دو بیٹیوں کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔چند برس پہلے وہ اور ان کی بیوی نے ہمارے گھر ملازمت اختیار کی،ان کی بیوی نہائت شریف عورت تھی دو بیٹیوں کی وجہ سے لوگ ان کا جینا حرام کیئے ہوئے تھے کہ ایک بیٹا ہو جاتا تو تم لوگوں کا بڑھاپا سنور جاتا حالانکہ کہنے والے شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ بہت سارے گھروں میں بیٹے والدین کے بڑھاپے کو سنوارنے کے بجائے اجاڑ دیا کرتے ہیں بہر حال یہاں اس قسم کی باتیں عام ہیں۔بیٹے کی پیدائش ہوئی اور جو تکلیفیں سلمہ نے اٹھایئں وہ کوئی محسوس نہیں کر سکتا مگر اس کے بعد جب ماں اور بیٹا دونوں اس جہاں سے گزر گئے تب سمیع بابو اور بچیوں نے جو مصیبتیں اٹھائیں وہ سب کے سامنے تھیں،کئی دن تک وہ باہر بابا جان کے سامنے آ کر روتے رہے انھیں بہت سمجھا کر گھر بھیجا جاتا کہ اپنی بچّیوں کو دیکھو اب تم ہی ان کا سہارا ہو۔۔دھیرے دھیرے ان کے دل کو قرار آ ہی گیا تو اپنی بیٹیوں کو جا کر گلے سے لگایا اور جینے کی کوشش کرنے لگے۔خلیق نے حقیقتاً ان کو بیحد سہارا دیا وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کے آنسو پوچھتی اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی اور سر دبا کر سلا دیتی۔پھر رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آ گئی اور سمیع بابو خود چولھے چکی میں جٹے۔ساتھ ہی خلیق سے بھی کام کرواتے وہ خوشی خوشی سب کر دیتی مگر جب اس کا دل نہ چاہت تو بس منھ پھلائے بیٹھی رہتی اور تب سمیع بابو اس کا منھ دھلا کر سر میں تیل لگاتے اور الٹی سیدھی چٹیا بنا کر ہمارے گھر چھوڑ جاتے۔میں جب ہوسٹل سے آتی تو گھر میں گاؤں کی عورتوں کا آنا جانا ہوتا ورنہ سنناٹے راج کرتے۔۔بابا جان صبح اٹھ کر

کھیتوں میں کام کروانے چلے جاتے اور بھیّا اگریکلچر میں ایم ایس سی کر کے بابا جان کے ساتھ نئے نئے تجربات کرتے رہتے۔ پڑھائی ختم ہوتے ہی عاصم کی امّی میرے لیئے رشتہ لے کر آ گئیں۔ میں تو گھر والوں سے شرمندہ سی ہوگئی جبکہ ہمارے بیچ کوئی ایسی بات ہوئی بھی نہ تھی۔تب میری سمجھ میں آیا کہ عاصم نے میرا پتہ کیوں لیا تھا۔ چچی جان نے مجھ سے مرضی لی تو میں نے منع بھی نہیں کیا۔ شادی تو کہیں نہ کہیں ہونا ہی ہے۔۔عاصم ہی سہی۔۔

امّی کے زیورات نکلوائے گئے۔۔کپڑوں کی خریداری شروع ہوئی اور بھی نا جانے کیا کیا۔۔۔۔

اسی وقت یہ قصہ بھی جاگ اٹھا۔ میں اپنی طرف سے اسے سمجھا بجھا کر بھیج دیا تھا۔۔کئی دن واپس نہیں آئی سلیمن نے آنسو پوچھتے ہوئے بتایا کہ ''دولھا بھائی آپا کا تھپّڑ مارن۔۔۔اور جبر دستی لئے گئے۔۔۔ابّا بہت روت رہے۔'' میں نے اسے بہت سمجھایا مگر سچ تو یہ ہے کہ میرا بہت دل دکھا۔ ایک ماہ کیسے گزر گیا کچھ پتہ نہیں چلا اتنے سارے کام تھے پھر عزیزوں کی آمد، مستقل کوئی نہ کوئی مہمان رہا چچی جان بھی رہنے کے لیئے آ گئی تھیں۔سلیمن برابر آ رہی تھی مگر وہ ابھی سب کام نہیں سنبھال پائی تھی اس لیئے بس سروری کی کچھ مدد ہو جاتی۔اس دن میں سر دھو کر نہائی کچھ سردی محسوس ہونے لگی تو چھت پر کرسی ڈلوا کر بیٹھ گئی۔تھوڑی دیر محسوس ہوا کہ پیچھے کوئی آ کر بیٹھ گیا ہے مڑ کر دیکھا تو خلیقن میلے کچیلے کپڑے پہنے گٹھری سی بنی بیٹھی تھی۔ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''خلیقن۔۔''؟ میں نے اسے چھوا تو وہ ایک دم زمین پر آ رہی۔۔دبلی پتلی، مدعوق چہرہ، پیلی سی آنکھیں بال الجھے دھول بھرے۔۔وہ بیحد برے حالوں میں تھی۔ میں بری طرح گھبرا گئی تھی۔ سروری کی مدد سے اس کو پلنگ پر لٹایا دودھ گرم کر کے پلوایا۔ وہ ہوش میں آ کر بستر سے اترنے لگی۔

''لیٹی ہوا بیٹا۔۔کیسی طبیعت ہے؟'' اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے بیحد رنج ہو رہا تھا

۔'' کچھ نہیں بیٹا۔۔''اس نے اپنے آنسو میلے روپٹّے میں چھپا لیئے

۔''بتاؤ۔۔۔کیا ہوا ہے کچھ کہا ہے کسی نے؟؟؟''اس نے شانے سے روپٹہ ہٹایا تو قمیص پھٹی ہوئی اور کاندھے پر گہرا زخم تھا

۔''او میرے خدا۔۔یہ کیا ہوا ہے؟''''ہمکالاٹھی سے مارت ہیں'وہ سسکنے لگی۔

۔''مگر کیوں کس لیئے؟؟میں بیقرار تھی

۔''کہت ہیں تمہرے ابّا نہ تو سائیکل دہین ہیں نہ اس کوٹر۔۔یا تو پیسہ لے کر آؤ نہیں تو اور مریئے'' اس نے روتے روتے بتایا۔۔۔''

افففف غضب خدا کا۔۔۔پہلے نہیں دیکھا اس نے؟؟کہاں سے دینگے یہ سب؟؟وحشی ہے یہ شخص ۔۔بالکل پاگل ہے۔''میں نے گرم پانی سے اس کا زخم صاف کیا دوا لگائی ایک جوڑا پہن وایا منھ دھلوایا۔۔۔وہ پورے وقت بس روتی ہی رہی۔

''بس بہت ہو گیا۔۔۔اب مت جانا اس کے پاس۔۔''اس نے زخمی ہرنی کی طرح مجھے دیکھا۔۔ میرا دل تڑپ گیا میں نے اسے بڑھ کر لپٹا لیا۔۔۔کچھ دیر کے بعد جب بابا جان اندر آئے تو بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے میں

نے ان کو یہ ساری بات بتائی تو خاموش رہ گئے۔پھر بولے''بیٹا۔۔۔یہ ان لوگوں کے ذاتی معملات ہیں،لڑکی کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔۔۔زیادہ سفارش کریں تو لڑکی بدنام ہو جاتی ہے۔تم یہ ساری باتیں نہیں سمجھ سکو گی۔۔بہر حال میں سمیع بابو سے بات کرونگا۔۔دیکھتے ہیں کیا ہو سکتا ہے۔۔آج کچھ دے بھی تو کل دوسری فرمائش نہیں آئے گی یہ کیا گارنٹی ہے؟''انھوں نے تھکے تھکے انداز میں بات ختم کی اور شیروانی اتار کر ٹانگ دی اور بستر پر لیٹ گئے۔

''کیا ہوا بابا جان؟کوئی مسئلہ ہے کیا؟''مجھے ان کے بے وقت لیٹنے پر حیرت ہوئی۔

''نہیں بیٹا۔۔بس تھک گیا ہوں۔۔۔''

''مجھے نہیں بتائیں گے؟؟''میں ان کے بال سہلانے لگی انھوں نے امّی کے بعد اپنے دل کی بات کسی سے بھی کہنا چھوڑ دی تھی۔ مجھے اس بات کا بیحد احساس تھا کہ وہ اپنی کوئی بھی تکلیف کبھی ہم میں سے کسی سے شیئر نہیں کرتے بس۔۔۔خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں ان کا سر دباتی رہی وہ بے خبر سو گئے۔ مجھے تجسس تھا شیروانی کی جیب سے ایک لفافے کی جھلک دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔۔۔وہ خط تھا کہ ایک شعلہ تھا جو پورے وجود میں پھیل کر مجھے خاکستر کر رہا تھا۔ ہوش اُڑ گئے تھے میرے۔۔۔۔ یہ ایک لمبی چوڑی فہرست تھی سامان کی۔۔ جو کہ عاصم کی طرف سے بھیجی گئی تھی۔ وہ تقریباً پچاس لاکھ کا سامان تھا جو کہ میرے جہیز میں مانگا گیا تھا۔۔ان کا کہنا تھا کہ بابا جان زمیندار رہ چکے ہیں زمینیں اور باغات کے مالک ہیں پھر اتنی سی رقم ان کے لیئے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ میرے دل کے آنگن میں کھلتا ہوا عاصم کے پیار کا نرم پودا دیک دم ہی مرجھا گیا۔۔۔وہ رات مجھ پر بہت بھاری گزری۔ ہم لوگ صبح ناشتہ کر رہے تھے کہ سلیمن زور زور سے روتی ہوئی اندر آئی۔۔۔

''یااللہ خیر۔۔۔''میں نے دل پر ہاتھ رکھا

۔''خلیقن مر گئی بیٹیا۔۔۔وہ لوگ خلیقن کا مار ڈالن۔۔۔'' وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی باہر سے بہت سارے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بابا جان ناشتہ یوں ہی چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ کئی عورتیں اندر آ گئی تھیں سب سلیمن کو تسلّی دے رہی تھیں مگر وہ ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی اس کی حالت دیکھ کر میرا بھی برا حال تھا،، ایک کہرام سا برپا تھا۔۔۔سنا کہ کل جب وہ اپنے گھر پہونچی تو وہ وہیں بیٹھا تھا۔ وہ اسے مارتا ہوا گھر لے گیا جب گاؤں والوں نے اسے روکا تو بدتمیزی سے بولا

''میری بیوی ہے۔۔۔جو چاہوں کروں۔۔۔کہو تو ابھی طلاق دیکر یہیں بیٹھا دوں۔؟ اور گاؤں

والے خاموش ہو گئے کہ وہ اس لفظ سے بہت ڈرتے ہیں۔صبح یہ خبر آئی کہ کھانا پکاتے ہوئے اسٹو و پھٹ گیا۔۔۔اور وہ جل کر مر گئی۔۔۔یہ وہی اسٹو و ہے جو وقتاً فوقتاً۔کم جہیز لانے والی بیٹیوں کو جلانے کے لیئے پھٹتا ہے۔سارا دن ان لوگوں کی دلجوئی میں گزرا شام ڈھلے وہ سب اپنے گھر گئے اور اس کی میّت آ گئی تھی دفن کی تیّاری ہو رہی تھی پوری گاؤں پر ہو کا عالم تھا۔رات ہو گئی تھی بابا جان گھر کے اندر نہیں آئے تھے پتہ نہیں کیا معاملات سلجھائے جا رہے تھے۔عاصم کا فون آ گیا

۔''کیسی ہو۔۔۔۔؟؟''

''ہاں ٹھیک ہوں''

''طبیعت ٹھیک ہے۔۔۔تمہاری آواز کیسی ہو رہی ہے؟''

''ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔۔تم سناؤ''

''دیکھو۔۔۔وہ ابّا نے کوئی رجسٹری وغیرہ بھیجی ہے بابا جان کو۔۔۔اب تم یہ سب دل پر مت لینا ۔۔۔کوئی ضروری نہیں ہے کہ ساری چیزیں ہوں تم لوگ اپنے طور پر دیکھ لینا۔۔۔جو بھی کمی بیشی ۔۔۔''''ایک بات سنو عاصم'' میں نے اس کی بات کاٹ دی

''میں بس ایک بات کہنا چاہتی ہوں''

''ہاں کہو کہو''

''تمہیں پتہ ہے جب فقیر بار بار دروازے پر آئے تو کیا کہتے ہیں؟''

''وہاٹ؟؟؟؟؟؟؟؟'' وہ زور سے چیخا

'' کہتے ہیں ۔۔۔ بابا معاف کرو۔۔کوئی اور دروازہ دیکھو'' میں نے فون پٹخ دیا۔اور خلیقن کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

چاند چہرہ

آج تقریباً ایک ہفتہ کے بعد ٹھیک سے بیٹھ کر آرام سے آیئنہ دیکھنے کی مہلت ملی تھی صبح کے دس بجے ہونگے۔ کمرے کا مشرقی دریچہ کھول دیا تھا، بڑی نرم سی خوشگوار، سبک ہوا چہرے کو چھو رہی تھی اچانک ہی میں چونک پڑی۔

۔ارے تو کیا میں بوڑھی ہو رہی ہوں؟؟؟ سنبھل کر آیئنہ مضبوطی سے پکڑ لیا پوری آنکھیں کھول کر دھیان سے دیکھا، واقعی چہرہ بجھا بجھا سا تھا، میں افسردہ سی پلنگ کے کنارے ٹک گئی۔ایک بار پھر آیئنے کو گھورا مگر بھلا گھورنے سے اس کا پارہ تھوڑی مر جاتا ہے۔ یہ تو آجکل کی لڑکیاں پرائیمری کلاس سے نکلیں اور پہونچ گئیں بیوٹی بارلر۔۔۔ نہ جانے کیا کیا کرواتی ہیں تھریڈنگ، ہیر ڈریسنگ۔ڈایٹنگ اور خدا جانے کیا کیا۔۔نہیں سیکھیں گی تو گھرداری۔۔ برتن نہیں دھوتی ہیں کہ ہاتھوں کا ستیاناس ہو جائے گا۔کھانا ان سے نہیں پکتا۔ کپڑے دھوئیں گی تو ناخون ٹوٹ جاینگے۔ ایک ہم ہیں ساری زندگی کام میں لگے رہے نوکروں کے ہوتے باورچی خانے میں گھسے رہے، جلد

کا حال خراب کر لیا۔میاں جی کی خوشنودی میں بریانی کوفتے بناتے رہے، ان کے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھونا اپنی خوش نصیبی سمجھتے رہے۔۔۔دنیا بھر کے کام لاد لیئے اور۔۔۔گالوں کو بے رونق کیا۔۔۔میاں دیر میں آئے تو پیشانی پر سلوٹیں۔۔بچوں نے ضد کی تو تیوری چڑھ گئی۔۔اور تو اور۔۔جب امّاں بی کو زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی تو پھر کیا اندر کا سارا پانی جل کے خاک ہو جاتا۔۔۔بس اس ضد پر تو پہلے سے اپنے کو ٹھیک ٹھاک کرنے کے لئے بیوٹی پارلر ضرور جانا ہے۔۔۔کوئی خرچہ ورچہ نہیں دنیا کسی کو۔۔۔اس بار جی بھر کے اپنی ذات پر خرچ کرنا ہے۔۔۔ میاں صاحب بھی تو اب نظر بھر کے نہیں دیکھتے۔۔فرصت کہاں؟ اور وجہ تو یہی ہے کہ میری صورت ہی ایسی ہوگئی ہے۔۔۔اور یہ نند صاحبہ اپنا گھر چھوڑ کے آبیٹھی ہیں۔۔۔ان کا خرچ الگ، کپڑے لتّے بناؤ کھلاؤ پلاؤ جان مارو۔۔

۔مگر کس کو فکر؟؟ ہم سے اب نہ ہوگا میں کہیے دیتی ہوں اس بار میں کہے دیتی ہوں اس بار میاں جی سے صاف بات کرنی ہے مجھے عید سے پہلے کم از کم دس ہزار اپنے لیئے لینے ہیں۔۔۔۔چاہے کہیں سے بھی دیں۔۔۔ مجھے نہیں پتہ۔۔۔ چہرہ ٹھیک ٹھاک کروانا ہے۔بال ترشوانا ہے اور ہاں پیڈی کیور مینی کیور بھی کرواؤنگی۔۔مگر پھر سارے خرچوں کا سوچ کر ٹھنڈے پسینے آنے لگے کہاں سے ہوگا یہ سب؟

بھلا حسنِ جہاں سوز کا خرچہ کہاں سے نکلے گا۔اب ایک بار پھر نا امیدی کا کالا سمندر تھا اور میں اکیلے آدمی کو بہکانے کے لیئے شیطان بھی تیار ہی بیٹھا رہتا ہے۔۔۔اکیلے اس لیئے کہ ساس اور نند کے پاس بیٹھ کر وقت ضائع کرنے سے اچھا اکیلے بیٹھنا لگتا ہے۔سو ہم نے پکّا ارادہ کر لیا۔۔۔ اس بار امّاں بہن کو کچھ دینے کی ضرورت نہیں۔۔۔اور ایک عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔تھوڑی بہت ڈسٹینگ کی۔رمضان میں کھانے سے تو فرصت ہی مل جاتی ہے۔۔۔کئی بار سوچا قران اٹھالوں

تلاوت کرلوں ۔۔۔مگر ذہن میں جملے ترتیب دینے تھے، کس طرح میاں کو قائل کرنا ہے کہ اس بار ''ان لوگوں کو پیسے نہ دیں ۔۔۔شام کے لیئے چنے بھگو دیئے ۔۔۔نند صاحبہ شام کو اکثر کوئی اچھی ڈش بنا دیتی تھیں ۔۔چلو اس سے بھی مجھے فرصت ہوگئی ۔شام کو گھنٹہ دو گھنٹہ امّاں کے پاس بیٹھ کر ہی کمرے میں آتے ہیں ۔۔۔چلو یہ تو کوئی بات نہیں بس میں ٹھیک سے ان کو قائل کرلوں ۔۔۔کسی طرح میری پریشانی سمجھ جائیں تو اور بہن کو دینے والے پیسے روک کر مجھے دے دیں ۔ پہلے میں ہوں ۔۔۔سوچتے سوچتے نیند آنے لگی اور وہیں ڈرائینگ روم میں ہی سو گئی آنکھ کھلی تو دیکھا میاں جی سامنے بیٹھے مجھے دیکھ رہے تھے چہرے پر پریشانی تھی

۔'' کیا ہوگیا ۔۔یہاں کیوں سوگئیں؟؟'' ''بس وہ ڈسٹنگ کر رہی تھی نیند آ گئی''

چلو کمرے میں لیٹ جاؤ ۔۔اب تو افطار کا وقت بھی قریب ہے ۔۔طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟؟ وہ فکر مندی سے پیشانی چھو کر دیکھ رہے تھے''

ہاں ٹھیک ہوں بس ۔۔'' میں آہستہ آہستہ اٹھ کر کچن کی طرف گئی ۔دیکھا دونوں ماں بیٹی افطار اور کھانا بنا چکی تھیں اب پلیٹیں نکال رہی تھیں ۔۔مجھے دیکھ کر بولیں '

' کیا ہوا دلھن؟؟ کیسی طبیت ہے''

'' ٹھیک ہوں'' میں نے لٹھ سا مار دیا اور کمرے میں چلی آئی بستر پر ڈھیر ہوگئی ۔۔آہ کتنا آرام ملا ۔۔۔صوفے پر تو کمر تختہ ہوگئی تھی ۔یہ الگ بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے

۔''سنیئے ۔۔''

''ہاں جی بولیئے'' انھوں نے اخبار کا کونہ ہٹا کر مجھ پر نظر ڈالی ۔'

' وہ میں یہ کہہ رہی تھی ۔۔۔کہ امّاں بی اور نگھت آپا کو جو پیسے ۔۔'' پوری بات منھ سے نکلی بھی نہیں تھی کہ وہ ایک دم اخبار رکھ کر میرے قریب آ گئے بولے '

’کتنی عظیم ہوتو شیریں۔۔تمہارا نام ہی شیریں نہیں تم سچ مچ شیریں زبان ہو۔۔کتنی فکر ہے تمکو امّاں اور باجی کی۔۔میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔۔بلکہ مین تو سمجھ رہا تھا تم عید کے پیسے دینے نہیں دوگی مگر میں غلط تھا۔۔مجھے معاف کردو شیریں میں نے تمہارے لئے ایسی بات سوچی بھی کیسے؟‘‘ انھوں نے ہتھیلیوں میں میرا چہرہ تھام لیا تھا اور بول رہے تھے کتنا چاند سا چہرہ ہے میری بیگم کا کسی میک اپ کے بغیر چمکتا ہے‘‘۔

☆☆☆

صدف رائیگاں

دہلی کا نقشہ اس نے اپنی اسکول کی کتابوں میں ہی دیکھا تھا، اور وہ راستہ کب اس کے پیرون تلے گزر گیا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ ان کا سفر رات ہوتے ختم ہوا۔ وہ ایک بلند و بالا جگمگاتی ہوئی عمارت کے سامنے کھڑی آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔ اس کے لیئے یہ سب ایک خواب سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ وہ ایک خوبصورت پانچ ستارہ ہوٹل تھا جہاں انھیں اس کے پاسپورٹ بنّے تک قیام کرنا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔۔۔مگر۔۔۔جب رات آئی تو اپنے قیامت لے کر آئی۔ وہ تو ابھی ان باتوں سے واقف بھی نہ تھی۔۔۔ایک بچّی تھی وہ۔ رات گزرتی رہی خواب ٹوٹتے رہے، صبح ہوتے ہوتے وہ حقیقت کی دنیا میں سورج کی روشنی سے آنکھیں چرائے بیٹھی اسے فطری طور پر گھر کی یاد ستانے لگی۔

کون آرہا ہے امّاں" اس نے اسکول کا بستہ پھینکا اور بلنگ پر رکھّی ڈلیا سے ایک سیب اٹھالیا۔

''ارے رک تو سہی۔۔رکھ دے یہ سیب'' اماں باورچی خانے سے چلاّئی

۔''کیا اسمیں کچھ ہے؟''اس نے گھبرا کر سیب واپس ڈلیا میں رکھ دیا

۔''نہیں بٹیا۔۔۔! تیرے ابّا کے کوئی ملنے والے آرہے ہیں تو تھوڑے سے یہ پھل۔۔۔

''انھوں نے چینی کا اکلوتا ڈونگا دھوکر ایک طرف رکھا اور اس کی طرف دیکھ کر بولیں''

تو نہا دھولے زرا۔۔اپنا عید والا جوڑا پہن لے۔۔۔مہمان آرہے ہیں نا؟؟؟''

''عید والا؟''اس نے حیرت سے امّاں کی طرف دیکھا کہیں مذاق تو نہیں کر رہی ہیں۔وہ جوڑا تو امّاں چھونے بھی نہیں دیتی تھیں کئی بار اس نے اپنی سہیلی کے گھر جاتے وقت پہنّے کی کوشش کی مگر ہر بار پھٹکار ہی ملی۔

''اچھا۔۔۔سلمی سے کہہ آؤں۔۔؟وہ پھر باہر بھاگی۔

۔''نہیں رک جا۔۔۔سن تو۔۔''امّاں پھر بے چین ہوکر پکاریں

۔''مگر امّاں۔۔چائے کا سیٹ تو وہیں سے آیئگا نا؟

''نہیں آیئگا میں نے تیرے لیئے جو رکھا تھا وہ نکال لیا ہے''وہ سر جھکا کر واپس باورچی خانے میں چلی گئیں۔وہ کچھ حیران حیران سی امّاں کو دیکھے گئی۔

۔اس کو یاد تھا کہ بچپن سے ابّا کی قلیل آمدنی اور امّاں کے صبر سے یہ گھر چل رہا تھا نہ تو امّاں اپنے لیئے کوئی فرمائش کرتیں نہ ان دونوں کے لیئے۔وہ سب کچھ محسوس کرنے لگی تھی مگر اپنی ساری حسرتیں دل میں رکھ کر چپ چاپ دال چاول کھا کر سو جاتی۔سلمی اور سویرا کی امّی اکثر اسے دوپہر کے کھانے کے لیئے روکتیں مگر اس کی انا کو گوارا نہ ہوتا۔ان کے گھر پر پکنے والے سالن کی خوشبو اسے کبھی کبھی بہت بے چین کر دیتی تھی مگر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے وہاں سے بھاگ آتی۔

ابّا کے دوست آ گئے تھے آج اس کے گھر یہ پہ بھی سالن کی بہت اچھی سی خوشبو آ رہی

تھی۔ کھیر بھی ایک عرصے کے بعد امّاں نے پکائی تھی مگر نہ جانے کیوں امّاں کی آنکھیں سرخ تھیں۔۔۔شاید دھویں سے؟ جی بھر کے سالن روٹی کھائی اس نے۔۔ایک پیالہ کھیر بھی امّاں نے اس کا پیالہ دوبارہ بھرنا چاہا تو اس نے منع کر دیا۔۔۔کتنا کھا سکتی تھی وہ؟

اس کی طلبی ہوگئی۔۔۔کمرے میں ابّا نہیں تھے وہ جا کر خاموشی سے بیٹھ گئی

۔''کیا نام ہے تمہارا؟ انھوں نے اسے گھورتے ہوئے مسکرا کر پوچھا

۔''انیسہ۔۔''اس نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھایا

۔''بہت اچھا نام ہے۔۔۔'' پیالی تھماتے ہوئے اس کی انگلیاں ان کی موٹی بھدّی انگلیوں سے الجھ گئیں۔اس نے کچھ شرمندہ ہوکر کچھ سوچا۔

نازش، سلمی سویرا۔۔یہ ہوتے ہیں اچھے نام۔۔۔میرا نام تو کتنا پرانا پرانا سا ہے

۔'' آپ کہاں رہتے ہیں۔۔۔''اس نے یونہیں بے تکا سا سوال کیا۔

وہ مسکرائے پیالی ہاتھ سے رکھّی۔۔''دبئ میں۔۔۔'' تب ہی اسے دوسرا سوال سوجھ گیا۔

۔''میں گڑیاں بنانا سیکھ تی ہوں دکھاؤں آپکو۔۔؟''

''ہاں دکھاؤ۔۔'انھوں نے اسے بغور سر سے پاؤں تک دیکھا، وہ تو بھاگنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی جھٹ پٹ بھاگی۔۔

''امّاں کون ہیں یہ؟ عجیب طرح سے دیکھ رہے ہیں۔۔۔میں نہیں بیٹھونگی وہاں۔۔''

وہ امّاں سے سٹ کر وہیں بیٹھ گئی۔انھوں نے اسے ایک دم لپٹا لیا

۔''بیٹی اچھّے آدمی ہیں۔۔۔مسلمان ہیں اور تیرے ابّا کو کام بھی دلوا رہے ہیں دوبئ میں۔۔۔'' پیار سے اس کے بال سنوارے پھر بولیں

۔''عامرہ اچھّے اسکول جانے لگے گی۔۔تیرے لیئے بھی کل جا کر اچھے سوٹ لے کر آؤں گی۔۔یہ

سب انھوں نے کیا ہے۔۔ برے آدمی نہیں ہیں بیٹا۔۔۔ ہر آدمی کا اپنا مزاج ہوتا ہے نا؟ تو تو میر ی بڑی سمجھدار بیٹی ہے۔پھل کھائے گی؟ لے لے'' انھوں نے کئی پھل اس کے سامنے رکھ دیئے ان کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں

۔''ہاں ہاں ٹھیک ہے پر تم رونے کیوں لگیں امّاں؟'''' ارے کچھ نہیں یہ بس یہاں دھواں ہو رہا ہے نا۔۔'' آج گھر میں سلمی کے گھر جیسی خوشبو آرہی تھی۔۔ اچھّے کھانوں کی خوشبو، پھلوں کی خوشبو۔۔اچھّے دنوں کی خوشبو۔

شام کو چندلوگوں کی موجودگی میں اس تیرابرس کی بچّی کا نکاح ساٹھ برس کے عبدل مجید کے ساتھ ہو گیا۔اور شام کو وہ لوگ دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت جب امّاں اس کی ضرورت کی چیزیں ایک سوٹکیس میں رکھ رہی تھیں تو وہ اپنے جمع کیئے ہوئے وہ موتی لینے دوڑی جو وہ اکثر ٹوٹے ہوئے ہار اور بندوں سے جمع کیا کرتی تھی۔ایک چھوٹا سا ڈبہ جسکا ڈھکن ٹھیک سے بند بھی نہیں ہوتا تھا۔۔۔اس نے جلدی سے اٹھانا چاہا۔۔۔ڈبّہ کھل گیا اور سارے موتی۔۔فرش پر بکھر گئے ۔۔۔ابّا اسے پکار رہے تھے۔۔۔وہ حسرت سے ان گرے ہوئے موتیوں کو دیکھتی ہوئی آکر باہر کھڑی ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ وہ راستہ کب اس کے پیروں تلے گزر گیا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔۔اور رات میں نا جانے کون سا وقت تھا جب ساتھ برس کے عبدل مجید اس پر چھا گئے اور اس کی چیخیں نکل نے لگیں۔۔نہ جانے کب تک وہ بے ہوشی کے سمندر میں تیرتی رہی اور کب ہوش میں آئی۔ یہ سب کچھ اس کی نازک ذہنیت کے لیئے ایک کربنک عذاب تھا۔ہوٹل کے سامنے اس لٹی پٹی حالت میں جب شازیہ اسے دیکھا تو چونک گئی۔۔۔اس چھوٹے سے اسکول کی یہ ذہین بچّی اب بھی کہیں اس کی یادداشت میں تھی۔اسکول کی نوکری چھوڑ کر اس نے اب ایک این.جی.او کا کام سنبھالا تھا

۔''کیا بات ہے بے بی۔۔؟ وہ قریب آ گئی اور انیسہ کو خبر بھی نہ ہوئی دل ہی دل میں اماں اور ابّا سے فریاد کرتی رہی

۔''ہیلو۔۔'' شازیہ اس کے پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اس نے چونک کر دیکھا

۔''ڈر کیوں گئیں؟ مجھے پہچانا نہیں؟ میں تمہاری شازیہ میم۔۔بھول گئیں؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی

۔انکل نہیں آئے تمھارے۔۔؟

''وہ انکل نہیں ہیں۔۔'' اس کے ہونٹوں سے چیخ کی صورت میں نکلا۔۔

۔''کون ہیں پھر؟؟؟''

''پتہ نہیں کون ہیں۔۔۔ مجھے بچا لیجئے میم۔۔۔ وہ مار ڈالینگے مجھ۔'' اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔شازیہ حیرات سے اسے دیکھ رہی تھی۔اس نے بےاختیار انیسہ کو گلے سے لگا لیا

۔''اچھا تم رو نہیں۔۔ڈرو نہیں بتاؤ مجھے تم یہاں کیسے آ گئیں'

'پانی پی کر اس کے حواس بجا ہوئے تو اس نے جو بتا سکی وہ شازیہ کے گوش گزار کیا

۔''میم وہ بہت خراب ہیں۔۔گندے آدمی ہیں۔۔ مجھے نہیں رہنا ان کے پاس انہوں نے بہت برا کیا میرے ساتھ'' وہ شازیہ سے لپٹی جا رہی تھی

۔''اچھا سنو سب ٹھیک ہو جائے گا تم گھبراؤ مت میں کوشش کرتی ہوں' وہ اسے گلے سے لگائے سوچتی رہی۔

اس کا واحد حل یہی تھا کہ پولیس میں شکایت کی جائے بچّی بہت چھوٹی تھی۔کیس کافی مضبوط تھا۔ بس تھوڑا وقت چاہیئے تھا۔۔۔وہ اسے اپنے کمرے میں سلا کر باہر آ گئی۔کئی لوگوں سے فون پر بات کرتی رہی۔کامیابی کی کافی امید تھی۔دوپہر تک گہری نیند سے وہ اٹھی تو ایک برے خواب کی طرح

اسے ساری باتیں یاد آ گئیں۔اسے شازیہ میم پر پورا بھروسہ تھا وہ کمرے میں لیٹے لیٹے اپنے کو آزاد تصور کرتی رہی۔۔۔اچانک اس کے ننھے سے ذہن میں ایک بجلی سی کوندھ گئی۔ابّو کو دبئی میں نوکری نہیں ملے گی، عامرہ کا اچھے اسکول میں داخلہ نہیں ہوگا۔۔۔گھر میں سالن نہیں پکّے گا اور جو کوئی دوسرے ''انکل'' آئے اوران کے ساتھ پھر آنا پڑا تو؟؟ وہ شازیہ کے بستر سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔۔۔سامنے اس کا کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔عبدل مجید حیران سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔۔۔اسے دیکھ کر جلدی سے اس کے قریب آ گئے

۔ ''کہاں چلی گئیں تھیں؟؟؟ انھوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔اوران کے ساتھ کمرے میں آئی اور دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

چمتکار

شام ہونے لگی تھی سورج نے آہستہ آہستہ اپنی دھوپ کی چادر سمیٹنا شروع کی۔بس درختوں کی پھنگیوں نے دھوپ کا دامن پکڑ رکھا تھا۔گرد اور دھول سے ماحول میں ایک عجیب سی گھٹن اور بیزاری کا احساس جاگ اٹھا تھا،بس اسٹینڈ پر گرد اور ڈیزل کی بو کی وجہ سے سانس لینا محال تھا۔آج پھر دوپہر والی بس چھوٹ گئی اس نے کوفت سے اس پاس کے ماحول پر نظر ڈالی، یہ بس اسٹینڈ گاؤں کے باہر پکّی سڑک پر بنا تھا، جہاں سے لوگوں کو کام لیئے شہر جانا آسان ہو گیا تھا۔ شام ہوتے ہوتے سارے لوگ واپس گاؤں آجاتے تھے۔ وہ سارے کام نپٹا کر دوپہر کی بس سے شہر جاتی ، پھول بیچتی ، پھولوں کے گجرے بناتی اور وہ بھی بیچ آتی شام کو خالی ٹوکری اور تھوڑے سے پیسے لے کر واپس آجاتی۔۔چند دنوں کا سہارا ہو جاتا۔

جب سے گود والا بچہ گھٹنیوں چلنے لگا تھا اس کو مائی نزیراں کے پاس چھوڑ کر روز ہی شہر کا چکّر لگا

لیتی۔۔۔مگر نکلتے نکلتے اکثر دیر بھی ہو جاتی تھی اور آج بھی یہی ہوا۔گاؤں میں تو کوئی پھول لیتا ہی نہ تھا۔شاید پھولوں کی ضرورت ختم ہو گئی تھی یا ان کی جیب اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنی گھر والی کے لیئے ایک گجرا ہی خرید لیں۔

وہ پھولوں کی بھری ٹوکری لیئے،بس اسٹینڈ کے پاس بہت دیر سر جھکائے بیٹھی رہی،بھوک سے اس کا سر چکرا رہا تھا بڑی مشکل سے اس نے اٹھ کر پاس لگے ہنڈ پمپ سے چلّو بھر کے پانی پیا اور شہر کے رستے کی طرف دیکھا۔آج پھر واپس گھر جانا پڑے گا بس تو چھوٹ چکی ہے۔

اور یہ پھولوں سے بھری ٹوکری؟؟؟؟کل ان باسی پھولوں کو کون خریدے گا؟آج کل تو لوگ ویسے ہی پھول کم لیتے ہیں۔شاید اب لوگ ان کی قدر کرنا بھول گئے ہیں۔اس نے جھنجھلا کر پوری ٹوکری پاس لگے ہوئے پیڑ کے نیچے الٹ دی۔

رات اگے بڑھ آئی تھی جانے والے واپس آنے لگے ڈرائیور۔۔مزدور اور دوسرے مسافر دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر کی جانب جانے لگے۔اِکّا دکّا لوگ آس پاس کی دوکانوں سے بیڑی سگریٹ لینے کے لیئے رک گئے تھے ایک ڈرائیور پیپل کے گھنے درخت کے پاس سے گزرا،اس نے پتّھر پر پڑے ہوئے تازے پھول دیکھے تو کچھ حیران ہوا۔۔۔دل ہی دل میں اپنے لیئے دعائیں مانگ کر آگے بڑھ گیا۔ایک شخص نے رک کر ان پھولوں کو دیکھا اور پاس کی دوکان سے ایک اگربتّی لے کر وہیں پھولوں میں اٹکا دی اور اپنے اچھّے دنوں کی دعا مانگ کر اپنے گھر کی راہ ہو لیا۔

دوسرے دن صبح صبح کئی لوگوں نے ان پھولوں اور اگربتّی کو دیکھا۔۔تو حیران ہوئے۔ایک نے تازے پھول رکھ دے اور دوسرے نے اگربتّی اور شمع جلا دی۔شام کو جب سب جمع ہوئے تو ان پھولوں اور اگربتیوں کی بات چلی۔بہت حیران تھے وہ لوگ کچھ نے بتاشے چڑھائے اور کچھ نے

پھول۔روشنیاں بھی جلائی گئیں۔دعائیں بھی مانگی گئیں

یہ بات گھروں تک پہنچ گئی۔۔۔عورتیں جوق در جوق پیپل کے پیڑ کے نیچے جمع ہونے لگیں۔۔۔ وہاں کھڑے ہوکر دکھڑے روئے جاتے اگر بتّیاں جلائی جاتیں اور تھوڑا سا سکون لے کر واپس چلے جاتے۔کئی دنوں تک کہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا اب تو آس پاس کی دوکان کے لوگ خود ہی روشنی اور خوشبو کا انتظام کر دیتے تھے اور تو اور۔۔۔اب ''پیپل والے بابا'' کے قصے بھی سنائے جانے لگے۔

۔ایسے ہی ایک بار بمبئی میں سمندر کا پانی میٹھا ہو گیا تھا،کئی مریض وہاں جا کر ٹھیک ہو گئے تھے۔۔۔ دیکھا جائے تو وہاں بھی سوائے عقیدے کے کچھ نہیں تھا۔۔۔یوں ہی دیوار پر ''سائیں بابا'' کی تصویر ابھر آئی تھی۔۔کرشن جی راتوں رات دودھ پینے لگے تھے۔سب ایک کمزور عقیدے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔۔۔اب یہاں کے قصّے بھی یوں ہی مشہور ہوئے۔۔۔کہ جب پھول دیکھے گئے تو بالکل تازے تھے اور اچانک اُگ آئے تھے کچھ لوگوں نے آوازیں سنی،عجیب عجیب قصّے کہانیاں آس پاس کے علاقوں میں گشت کرنے لگیں۔کئی دنوں کی میٹنگ کے بعد طے پایا کہ باقائدہ مزار بنایا جائے،ایک چہار دیواری کھینچ کر اس جگہ کو محفوظ کرنا ہے۔

۔بس لوگ لگ گئے۔۔کسی نے اینٹوں کا انتظام کیا کسی نے سیمنٹ کا۔۔۔۔سبھی نے حسب حیثیت پیسوں کا انتظام کیا۔اور اچھی خاصی عمارت بنکر تیّار ہو گئی۔۔باقائدہ چادریں چڑھنے لگیں، جس روز عمارت بنی اس دن وہاں ایک جشن ہوا۔بسوں کی گھڑ گھڑاہٹ لوگوں کو پسند نہیں آئی تو ایک درخواست دیکر بس اسٹینڈ وہاں سے ہٹادیا گیا،اس پاس کی دوکانیں بھی ہٹانی پڑیں۔

لوگون کا بہت نقصان بھی ہوا۔لیکن ایک ہستی ایسی تھی جس کو مزار بننے سے بہت فائدہ ہوا۔اس کو اب شہر جانے والی بس کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا کیونکہ اس کے سارے پھول اسی مزار پر بِک

جاتے تھے۔

☆☆☆

جہاں سے سلسلہ ٹوٹا۔۔۔!

ذکیہ نے دوسری بار چائے گرم کرنے سے منع کر دیا اور غصّے سے کمرے کا دروازہ زور سے بند کر کے چلی گئی۔

''بس۔۔لاونج میں بیٹھی بڑبڑا رہی ہوگی۔۔میں کیا کروں آخر کیسے اس کی بات مانوں؟؟؟؟؟ دل نہیں مانتا میرا۔۔''بھیّا دور گاؤں میں بیٹھے کیسے کیسے مسائل کا سامنا کر رہے ہونگے۔۔۔میں سیدھے جا کر ان سے کہوں۔۔مجھے جایئداد کا حصّہ چاہیئے۔

کوئی بات ہوئی ذمہ داری تو کوئی اٹھائی نہیں اور حصّہ مانگنے کھڑا ہوجاؤں؟؟ کیسی عورت ہے یہ۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں یہاں آ رہا تھا بھیا مجھے رخصت کرتے وقت کیسے کپکپا رہے تھے جیسے ان کے جسم کا کوئی حصّہ کاٹ کر الگ کیا جا رہا ہو۔۔مگر میں خوش تھا میری برسوں کی آرزو پوری ہو رہی تھی میں اپنی خوشی میں ان کے درد کو محسوس ہی نہیں کر سکا تھا۔۔۔مگر آج جب سوچتا

ہوں تو لگتا ہے کہ جدائی کا درد میں نے بھی سہا ہے بس۔اس وقت مجھے اظہار کرنا نہ آیا۔۔۔ذکیہ تو میری زندگی میں بہت بعد میں آئی

یہاں پڑھائی کے دوران، اس سے کس طرح دوستی ہوئی۔ یہ اب پرانی بات تھی اب تو میری دو بیٹیوں کی ماں تھی، ہماری دوستی جب ختم ہو چکی تھی۔

۔ ہمارے درمیان روز جھگڑے ہوتے ہنگامہ آرائی ہوتی اور بچّیاں سہم سہم کر کونوں میں دبک جاتیں۔ان کے معصوم چہروں پر اک خوف اک بے چارگی ہوتی۔ میں اور ذکیہ کبھی اس بات کی کوئی فکر ہی نہیں کرتے تھے۔اس کا اصرار تھا کہ میں ہندوستان جا کر بھیّا سے اپنے ابّا کی جایداد میں حصّہ مانگوں۔۔اور میں جو اتنے عرصے میں بھیّا کی خیریت کے لیئے ایک فون نہ کر سکا اور اچانک۔

کبھی کبھی میں اپنے آپ کو بیحد مجبور محسوس کرتا کتنے سارے خرچ منھ پھاڑے ہمارے سامنے کھڑے رہتے ہم دونوں ملازمت کرتے تھے مگر ہم نے اپنی ضرورتوں کو اس حد تک بڑھا لیا کہ پوری ہی نہیں ہوتی تھیں۔

آخر کار میں چل پڑا۔۔۔جس راہ پر وہ مجھے چلانا چاہتی تھی۔بھیّا کو فون کر کے جب میں نے اپنے آنے کی خبر دی تو وہ جذبات کی شدّت سے کچھ بول ہی نہ سکے۔۔۔خاموش رہ گئے۔۔۔

''بھیّا۔۔؟ آپ سن رہے ہیں نہ؟''

''آں۔۔ہاں تم سچ مچ آ رہے ہو نا؟؟؟''ان کی آواز بھّرا رہی تھی۔

اور میں پہونچ گیا تھا۔۔۔۔ان کے شفیق سینے سے لپٹا ہوا تھا ان کے جسم سے مجھے ابّا اور امّاں دونوں کی خوشبو آ رہی تھی۔۔ وہ ایک دم ابّا جیسے ہو گئے تھے ویسے ہی سفید بال ویسے ہی دبلے پتلے۔۔چہرے پر وقت سے پہلے ویسی ہی جھرّیاں۔۔گاؤں کی سڑکیں بن گئی تھیں۔۔۔دونوں طرف گھنے گھنے پیڑ ہمارے ساتھ تالیں بجاتے ہوئے چل رہے تھے۔نہر کی پلیا پکّی بن گئی تھی

چوڑی سی نہر کا پانی شل شل بہہ رہا تھا بچپن کی کتنی ساری یادیں آ ئیں اور پانی کے ریلے میں ساتھ ساتھ بہہ نے لگیں، میں راستے کی خوشبو سے مدہوش بیٹھا رہا، بھیّا مجھ سے باتیں کر رہے تھے ذکیہ اور بچّوں کے بارے میں، میرے کام کے بارے میں اور نہ جانے کیا کیا۔۔ مجھے جیسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔ میں جیسے کسی اور ہی دنیا میں پہونچ گیا تھا۔ ذرّے ذرّے میں اپنا بچپن ہنستا کھیلتا دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ دل کی تمام گرہیں ایک ایک کر کے کھل رہی تھیں میں جیسے اپنے آپ سے آزاد ہو رہا تھا۔۔جی رہا تھا۔۔۔ہنس رہا تھا، رو رہا تھا

۔گاؤں پہونچ کر ہم سب سے پہلے امّاں اور ابّا کی قبر پر گئے برسوں بعد میں ان کی یاد میں سسک سسک کر رو یا، میں نے کبھی انھیں یاد نہیں کیا تھا۔۔۔ کبھی ان کی یاد میں اس طرح آنسو نہیں بہائے تھے مگر آج جذبات کی شدّت میں روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں، بھیّا میری پیٹھ سہلا رہے تھے وہ مجھے سہارا دیے ہوئے تھے۔ گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو ایک نرم اور خنک سی خوشبو نے میرے گال سہلا دیئے۔۔۔فیّاض دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا، برامدے میں پلنگ پر ریاض باہیں پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے حیرت سے بھیّا کی جانب نگاہ کی تو وہ نظریں چرا گئے۔ دوڑ کر اسے لپٹا لیا۔۔۔گل مہر کے نیچے بھابی الگنی پر کپڑے پھیلا رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو جلدی سے کپڑے یونہی پھینک کر ہنستی ہوئی آ ئیں اور آ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ بھابی کے بال سفید ہونے لگے تھے، رنگ کمھلا گیا تھا، ہاتھوں کی نسیں ابھر آئی تھیں۔۔۔ میری نگاہوں میں وہ خوبصورت، حسین ترین لڑکی آ گئی جو چند برس پہلے پائلیں چھنکاتی اس آنگین میں اتری تھی، گورا رنگ، سیاہ گھٹاؤں جیسے بال۔۔ گہرا کاجل لگائے سیاہ شرارتی سی آنکھیں۔۔ میں اس ادھیڑ عمر عورت میں اپنی بھابی ڈھونڈ رہا تھا۔

دونوں بچوں نے مجھے گھیر رکھّا تھا، بھابی نے دسترخوان بھر دیا تھا، بھیّا محبت سے مجھے ایک ایک چیز کھلا رہے تھے۔ باہر کسی نے آواز دی تو بھیّا اٹھ کر باہر نکل گئے۔ پھر ایک لڑکا مجھے بلانے آ گیا۔

باہر''ہری'' کھڑا تھا۔میرا پیار دوست۔۔۔میرا یار''ہری پرشاد'' اور میں اس کی طرف بے تابی سے بڑھا تو وہ جھجھک گیا۔۔۔شاید میری ظاہری حیثیت سے۔۔۔میں نے اسے ایک دم گلے سے لگا لیا۔

۔''کیسے ہو دوست۔؟؟''

''بہت اچھّا کیہو کہ آئے گیئو۔۔۔۔بہت یاد کیا تمکا'' اس نے کاندھے پر پڑے انگوچھے سے اپنے آنسو پوچھے اور معصوم سی ہنسی ہنس پڑا۔۔۔ہم دیر تک ٹہل ٹہل کر باتیں کرتے رہے اسی نے ریاض کے پیر کی چوٹ کا بتایا۔ وہ پیڑ سے گر گیا تھا شروع میں گاؤں میں ہی علاج ہوا، شہر جا کر علاج کروانا بھیّا کے لیئے مشکل تھا، اس کے بعد وہ گئے بھی مگر ریاض کا چلنا پھرنا ایک طرح بند ہی ہو گیا۔ایک آپریشن کی ضرورت تھی۔

''اچھّا کیہو تم آئے گئے، بھیّا بے چارے اکیلے پڑ گئے ہیں'' دوسرے دن اور کئی لوگون سے ملا، ریاض کی میڈیکل رپورٹس دیکھیں۔بھیّا سے شہر جا کر رہنے اور اس کے مستقل علاج کی بات بھی کی، رات ہو رہی تھی،

باہر کسی نے آواز دی بھیّا اٹھکر باہر چلے گئے، میں اپنی چائے کی پیالی لیئے ہوئے ہی باہر نکل آیا۔وہ گاؤں کی طرف چلے گئے تھے ہری باہر کھڑا تھا مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔

''کیا ہوا یار۔۔۔''

''تمکا ہوش کہاں رہت ہے؟ مار چائے پہ چائے او کے بعد بیڑی سٹاسٹ مارے رہت ہو۔۔۔ اس نے میری بہترین برانڈ کی سگریٹ کا''بیڑی'' کہہ کر ستیاناس کیا۔اور میں کھلکھلا کے ہنس پڑا۔ایک مدّت کے بعد یہ ہنسی مجھے نصیب ہوئی تھی۔۔میں نے دل ہی دل میں ذکیہ کو شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے میری جنّت لوٹائی

۔''ہوا کیا ہے؟'بھیا کہاں گئے۔

'دین محمد منسی جی یاد ہیں تمکا؟؟ اور وہی جون بڑے مالک کے جمانے ما حساب کتاب دیکھت رہیں؟؟ بڑے مالک ان کا گھر بنوائے دیہن رہے۔۔کھیت بھی دیہن رہیں۔۔۔ابھہن ہم ان کا دیکھا۔۔پلیا پہ بیٹھے گُر گرُات رہیں۔۔ان کا اٹھائے کے تپتا پہ بیٹھاوا چاہ پلاوا۔۔۔تب جائے کے جان ماں جان آئی۔ مار رُوت رہیں۔۔''

''مگر کس لیئے۔۔؟''

''ارے میاں بی بی ماں لڑائی ہوت رہی لڑ کے ان کا مارِن ہیں لاٹھی سے۔۔بچر اؤ کا۔۔''

''مگر کیوں مارا انکو۔۔؟ میں ایکدم بے چین ہو گیا۔

''وہی جایئداد کی کھاتر مارن ہیں۔۔اوتو سنت منئی ہیں لڑ کے چاہت ہیں گھر دوار سب لڑکن کے نام لکھ دیں، بے چارے دین محمد کا کا تو اب کچھ نہیں بولت ہیں ہیں۔۔۔۔ پہلے کتنا ہنست بولت رہے مگر جانت ہو؟ دکھُ کا جھیلئے کا یہوا ایک طریکہ ہے کہ آدمی چپ ہو جات ہے۔۔۔مگر چپُ رہے یا بولئے۔۔دکھی آدمی تو دکھی رہت ہے نا۔۔۔۔''؟

وہ کیا فلسفہ کہہ گیا تھا۔۔۔۔جس نے میرے اندر ایک تڑپ سی پیدا کر دی۔۔۔۔بھیّا تو بہت چپ رہنے لگے ہیں۔

دین محمد کا بھی وہی قصہّ تھا جو عام طور سے جائیداد والوں کا ہوتا ہے، وہ جانتے تھے کہ اگر گھر بچّوں کے نام لکھا تو وہ اسے بیچ کر اڑا دینگے سر چھپانے کی جگہ بھی نہ بچے گی، اسی لیئے بچّوں سے مار کھاتے رہے مگر گھر اور کھیت ان کے نام نہیں کیا۔ا

اور میں کیا کر رہا ہوں؟؟؟؟ میرا سر چکرانے لگا تھا۔۔۔میں اندر آ کر چپ چاپ لیٹ گیا۔۔۔نہ جانے کب سو گیا۔۔

۔صبح روز کی طرح خوبصورت تھی میں بھابی اور بچوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تب بھیّا آ گئے اور کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولے'

’یہاں آؤ میاں۔۔‘‘ وہ ابّا کی طرح بلانے لگے تھے مجھے۔۔۔ میں جا کر ان کے پاس بیٹھ گیا انھوں نے ایک فائیل میرے سامنے رکھ دی۔‘

یہ سب تمہارا حصّہ ہے اس میں سارے کاغذات ہیں آدھے کھیت دو باغ اور اس گھر میں بھی تمہارا حصّہ بنتا ہے۔ رہنے کو تو تم آؤ گے نہیں۔۔۔۔ تو اگر مناسب سمجھو تو گھر کا حصّہ مجھے فروخت کر دو، باقی جیسا تم چاہو۔

۔‘‘میں اٹھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔۔۔ اور ان کے ہاتھ تھام لیئے۔

’بھیّا یہ سب مجھے نہیں چاہیے۔۔ بس میں جب بھی آؤں میرا پلنگ اپنے پلنگ کے ساتھ بچھوائے گا۔ بھابی یونہی میرے لاڈ اٹھائیں۔۔۔ بچّے ایسے ہی مجھ سے فرمایشیں کریں۔۔۔ اور مجھے کچھ بھی نہیں چاہیئے ۔ اور بھیّا ۔ اگر کچھ حصّہ فروخت ہو سکے تو کر دیجئے اور ریاض کا علاج ٹھیک سے کروا دیجئے ۔۔ میرے ویزے کی مدّت ختم ہو رہی ہے چھٹّی بھی ورنہ میں خود۔۔۔ اگر یہاں ممکن نہ ہو تو میرے پاس آ جایئے۔۔۔‘‘ میری آواز بھرّانے لگی تو بھیّا نے فائیل رکھ کر مجھے گلے لگا لیا، ہم دونوں بھائی جدائی کے صدمے سے نڈھال بیٹھے رہے۔

چلتے وقت کچھ چیزیں نکال کر میں نے اپنا والٹ ہری کی قمیض کی جیب میں زبردستی ڈالا وہ ناراض ہونے لگا ’’ای کا کرت ہو؟؟؟؟؟‘‘

’’پلیز۔۔ کچھ مت بولو ہری!‘‘: اس نے بھیگی بھیگی نظروں سے مجھے دیکھا پھر ایک جیسے دو انگوچھے نکالے’’ای دیکھو ہم تمرے واسطے لائے۔۔۔‘‘ میں نے اس کے ہاتھ سے ایک انگوچھا لے کر چوم کر آنکھوں سے لگایا اور گلے میں ڈال کر آنسو بھری ہنسی ہنس دیا۔۔۔

میں واپس لندن آ گیا ہوں۔۔۔ سب کچھ ویسے ہی ہے۔ میں وہاں سے لازوال یادیں ساتھ لے کر آیا ہوں۔ میں نے اپنی بیٹیوں کو وہاں کے قصّے سنائے بھابی کی دی ہوئی سوغاتیں انھیں اور ذکیہ کو دیں مگر ذکیہ نے وہ ساری کی ساری پھینک دیں۔ میں کیا کہتا۔۔۔؟ میرا لڑنے کو بھی دل

نہیں چاہتا۔۔بس ہری کی ایک بات میرے ساتھ چلتی ہے کہ دُکھ کا مقابلہ کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ آدمی چُپ ہو جائے۔۔۔اور میں چپ ہو گیا ہوں۔۔۔

☆☆☆

لبّیک

غریب معصوم و مسکین مجید بابو نے دوبارہ اپنی کانپتی ہوئی انگلیاں اپنی پرانی گھسی ہوئی واسکٹ کی جیب میں ڈال کر موجودہ رقم کو محسوس کیا ۔

چہرے پر پھیلی ہوئی غربت کی جُھرّیاں کچھ کم نظر آنے لگیں پیروں میں گھسا ہوا جوتا جو کبھی حاجی ولایت شاہ نے اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے کی عیوض بنواکر دیا تھا اور کئی بار مرّمت ہوجانے کے باوجود ایڑی میں کیل چُبھتی ہی رہتی جس کی وجہ سے ایڑی میں مستقل زخم ہوکر رہ گیا تھا اور جس کی پرواہ کرنا بھی انھوں نے چھوڑ دی تھی کیونکہ انھیں تو بس ایک ہی فکر کھائے جارہی تھی ۔

''عارفہ کا بیاہ کیسے ہوگا؟ کہاں سے میں اتنی رقم لاؤں گا؟ '' اب تو

وہ بس ڈاک خانے کے باہر ٹوٹی کرسی پر بیٹھے ان پڑھ لوگوں کے پوسٹ کارڈ لکھتے یا پھر منی آرڈر پر دو لائن کی تحریر جس سے دن بھر میں دس بیس روپیہ بن جاتے مگر اب اس میں بھی کمی آنے لگی تھی لوگ خط ہندی میں لکھوانے لگے تھے یا ٹیلی فون پر ہی بات کر لیتے بس چند غریب لوگوں کی وجہ سے ان کا کام چل رہا تھا اب تو آنکھوں سے بھی ان کو کم نظر آتا تھا ورنہ اسکول کی اچھی بھلی نوکری سے کیوں جواب ملتا ۔

اسکول کی پنشن اور ڈاک خانے کے باہر سے کمائے ہوئے روپے ملاکر پانچ سو کے قریب ہوجاتے تھے لیکن بیوی کے کُھردُرے ہاتھوں پر جب صرف تین سو روپے رکھتے تو خود ان کا دل خون کے آنسو روتا کہ کاش دوسروں کی بیویوں کی طرح عالیہ بیگم بھی جھگڑا کریں، لڑیں، پیسے پھینک دیں ،میکے چلے جانے کی دھمکی دے ڈالیں مگر ایسا کچھ نہ ہوتا۔ مسکین سے مجید بابو کی مسکین سی بیوی عالیہ بیگم ہاتھوں میں نوٹ لے کر آسمان کی طرف دیکھتیں اور خدا کا شکر ادا کرتیں ۔ گھر کے کام کاج کے ساتھ ساتھ پڑوسیوں کے کپڑے بھی سیتیں اور عارفہ کے لیے کبھی ایک جوڑا کپڑا اور کبھی کوئی چھوٹا موٹا برتن لے کر اُسی بکس میں ڈال دیتیں جو ان کی امیدوں کا واحد مرکز تھا ۔

عارفہ اب اٹھارہ سال کی ہوگئی تھی۔سرخ و سپید کتابی چہرے پر سجی سیاہ بھونرا جیسی آنکھوں میں جب طرح طرح کے خواب کروٹیں لیتے تو وہ نظریں جُھکالیتی اور اس کی نظریں ہمیشہ ہی جُھکی رہتیں سر پر پلو لمبے بالوں کا

جوڑا یا چوٹی ہمیشہ تیل میں چپڑی رہتی کہ کہیں کوئی ان لمبے حسین بالوں میں نظر نہ لگادے یا کسی کی نظر نہ پڑجائے۔ نیک ماں باپ کی نیک اولاد جس کا حُسن اس کی ہر جُنبش میں تھا ۔

جب دروازے کی کُنڈی کھٹکی تو عارفہ بچوں کی طرح قلانچ بھر کر دروازے پر پہنچ گئی ۔

''بابا آپ آگئے '' اس نے ہاتھ سے جھولا لے لیا ۔

''ہاں بٹیا'' ! مجید بابو کی تھکن کو زندگی مل جاتی۔ جلدی سے وہ برآمدے کا پلنگ بچھاکر پانی لینے دوڑ گئی پانی کے ساتھ چند پکوڑیاں جو اس نے صرف اپنے بابا کے لیے کھانا پکانے کے دوران بنالی تھیں لے کر آ گئی اور جب تک مجید بابو پانی پیتے رہے اس نے ان کے پاؤں دھو ڈالے۔ اپنے دوپٹے سے ان کے پاؤں خشک کرکے تسلہ اٹھالیا۔

''بابا چائے بناؤں۔؟''

''نہیں بٹیا آج گرمی بہت ہے ابھی دل نہیں چاہتا ابھی حاجی ولایت شاہ کی طرف بھی جانا ہے'' وہ پھر اپنی انگلیوں سے جیب میں حرارت محسوس کرنے لگے ۔

عارفہ ان کے سرہانے تکیہ رکھ کر اپنے کاموں میں لگ گئی ۔

بیوی کے آجانے پر مجید بابو اٹھ کر بیٹھ گئے ۔

''لو بھاگوان تمہارے کہنے پر اس بار پیسے جمع کروانے نہیں گیا ابھی جاکر وہ پیسے بھی لے آؤں گا جو کئی برسوں سے عارفہ کے لیے جمع کر

رہا ہوں پھر تو سب کام ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا نا۔؟''

''ہاں عارفہ کے ابّا ۔ ہم غریبوں کی بیٹیاں عزت سے اپنے گھر کی ہوجائیں اس سے بڑی ہماری کوئی تمنّا کہاں ہے ۔ خدا کا دیا جو ہے سو بہت ہے شکر ہے اس پروردگار کا کہ اتنا اچھا گھر مل گیا نہ جہیز کی مانگ کی ہے نہ اور کوئی فرمائش ۔ سب ہوجائے گا اب فکر مت کرو ۔ بس اللہ کا نام لے کر جاؤ اور وہ دس ہزار لے آؤ جو جمع کیے ہیں''۔ وہ جُھک کر چادر برابرکرنےلگیں ۔

''ہاں عالیہ بیگم حاجی صاحب بھی ہمارے لیے مددگار ثابت ہوں گے تھوڑا بہت بیٹی عارفہ کے لیے اپنے پاس سے بھی ضرور دیں گے ۔''

''نہیں عارفہ کے ابّا ۔ اللہ کے سوا کسی اور سے کبھی اُمیدیں نہ لگایا کرو ، پوری نہ ہوں تو بڑا دُکھ ہوتا ہے بس اللہ حلال رزق میں بیڑہ پار لگائے ،جو پیسہ پیٹ کاٹ کاٹ کر اتنے برس جمع کیا ہے لے آؤ تو کچھ کپڑا لتّا خرید لیں ۔ ایک چاندی کا سیٹ خرید لیں تو ہماری بٹیا سج جائے گی ۔ آگے اُس کی قسمت۔''انھوں نےایک ٹھنڈی سانس لی۔

عارفہ باورچی خانے کے دروازے سے طلوع ہوئی ، چائے لاکر دونوں کو تھمائی اور سرجُھکائے واپس باورچی خانے میں غروب ہوگئی ۔

شام ہوچکی تھی یہ سوچ کر کہ حاجی ولایت شاہ گھر پر ہی مل جائیں گے مجید بابو اپنی کھٹارا سائیکل لے کر چل پڑے ۔ ہزاروں خواب ان کے کمزور سینے میں سج رہے تھے اکلوتی بیٹی کا بیاہ ان کی زندگی کا بہت بڑا

خواب تھا اس خواب کو پورا کرنے میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ برسوں کی گاڑھی کمائی امانتاً ولایت شاہ کے پاس رکھواتے تھے کیونکہ محلے میں سب سے محترم اور بزرگ وہی تھے ان کے دونوں بیٹے بھی حج کی سعادت حاصل کرچکے تھے ۔ تیسرا بیٹا جو سب سے چھوٹا تھا شہر میں پڑھتا تھا چھٹیوں میں آیا کرتا تھا ۔ حاجی ولایت شاہ کو اس کی عادات سخت ناپسند تھی ۔

جب مجید بابو کی سائیکل ولایت شاہ کے گیٹ میں داخل ہوئی تو وہ بیٹھک میں آچکے تھے ۔ محلے کے کچھ اور لوگ بھی وہاں بیٹھے تھے مجید بابو نے جب اندر آنے کے لیے قدم بڑھائے تو ولایت شاہ کی آواز گھن گرج کے ساتھ سنائی دی

''آؤ آؤ میاں مجید کہاں تھے بھئی اتنے روز بعد نظر آئے ۔''

''سلام علیکم سرکار۔ سرکار پچھلے مہینے ہی تو......''

پھر وہ خاموش ہوگئے ۔

''اچھا اچھا تو بھئی آج ہماری یاد کیسے آگئی ۔'' انہوں نے پاس رکھے حقے کی خوشبودار منال منھ سے لگالی اور دو تین کش لے کر انھیں مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔ مجید بابو مؤدب بیٹھ گئے ۔ ایک ایک کرکے لوگ رخصت ہونے لگے مجید بابو کی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ مُدعا کیسے کہیں ۔ پھر انھوں نے جی کڑا کرکے کہہ دیا ۔

''وہ جی سرکار کچھ روپیہ جو ہم نے جمع کروایا تھا وہ لینا تھا''

''کون سا روپیہ مجید میاں ؟ کہاں جمع کروایا ہے؟'' ولایت شاہ نے

حقے کی منال منھ سے نکالی اور مجید بابو نے چونک کر ان کی طرف دیکھا ،جانے والے لوگ جوتا پہنتے پہنتے رُک گئے ۔ مجید بابو نے سوچا کون سا اتنا زیادہ روپیہ ہے حاجی صاحب کے لیے ،بھول گئے ہوں گے ۔

''وہ جی دس ہزار روپے یہیں آپ کے رجسٹر میں جمع کروایا تھا ۔ گھر میں تو سو خرچ ہوتے ہیں سرکار اس واسطے......''

''مجید میاں گھانس کھا گئے ہو ۔ ایک نہ دو پورے دس ہزار ! بھائی کہیں رکھ کر بھول تو نہیں گئے۔''

''جی نہیں سرکار ...... وہ کاپی میں شہروز میاں نے خودٗ' مجید بابو حواس باختہ تھے۔

''شہروز ......'' ولایت شاہ نے کڑک کر بڑے صاحبزادے کو آواز دی ۔

سر پر ٹوپی لیے شرعی کرتے پائجامے میں ملبوس شہروز باہر آ گئے

''جی ابّا '' وہ بڑے سکون سے ابّا سے جُھک کر بولے۔

''بھئی کسی رجسٹر میں مجید میاں کا روپیہ درج ہے؟ دس ہزار بتاتے ہیں ''۔

''نہیں ابّا رجسٹر تو ہم ہی تیار کرتے ہیں ان کا نام تو کہیں نہیں ہے۔''

''مگر سرکار......'' مجید بابو بری طرح کپکپا رہے تھے

''مہروز سے کہو رجسٹر لے کر آئے''

ولایت شاہ پھر دھاڑے ۔سعادت مند مہروز میاں سفید بُرّاق کرتا پائجامہ زیب تن کیے ہوئے شرعی داڑھی ،ہاتھ میں موٹا سا رجسٹر لیے ہوئے نمودار ہوئے ۔

''ہاں بھئی کس تاریخ میں پیسہ جمع ہوا ہے''

ولایت شاہ کی آواز پھر گونجی ۔

''جی پانچ سال سے ہر سات تاریخ کو ...... جی..... پیسے جمع کرواتا رہا ہوں ۔ پچھلے ماہ پوچھا تو آپ نے کہا کہ تم تو رئیس ہوگئے اب دس ہزار ہوگئے ہیں اور......''

''اچھا اچھا خاموش رہو.....'' مہروز نے زور سے ڈانٹا اور رجسٹر کے ورق پلٹنے لگے ۔

''تاریخ سات مئی سن......یہ......یہ......یہ......یہاں تو مجید میاں آپ کا کہیں نام نہیں''

''اچھا چھ تاریخ اورآٹھ میں بھئی دیکھو''

ولایت شاہ نے فرمایا۔

مگر نام کہیں ہو تو ملے۔

مجید بابو کے بدن میں خون کا آخری قطرہ بھی نچڑ چکا تھا ۔ حیرت اور غم سے اُن کی آواز بھی بند ہوگئی تھی ۔ انھیں لگا کہ وہ ابھی دم توڑ دیں گے تبھی شرٹ پینٹ میں لاپرواہی سے چلتے ہوئے پرویزشاہ اندر سے برآمد ہوئے ۔ہاتھ میں کرم خوردہ سا رجسٹر تھامے ہوئے تھے ۔ باپ کے قریب جاکر کافی تلخ لہجے میں گویا ہوئے ۔

''ابّا یہ ہے وہ رجسٹر جس میں مجید چاچا کے روپے لکھے ہیں اور ان کے دستخط بھی ہیں۔ آپ کے بھی ہیں۔ رقم دس ہزار سے کچھ زیادہ ہی بنتی

ہے۔ آپ ان کو غلط رجسٹر دکھارہے تھے''۔

ولایت شاہ نے سرخ سرخ آنکھیں اٹھائیں اور چھوٹے بیٹے کے ہاتھ سے رجسٹر لے لیا اور دیر تک اُسے دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے

''معاف کرنا مجید میاں...... یہ لوگ دوسرا رجسٹر اٹھا لائے تھے دراصل میں تو عمر کی ایسی منزل میں ہوں کہ کچھ بھی یاد نہیں رہتا اب تو سارا کام یہی بچے دیکھتے ہیں ۔

شہروز میاں ! '' انھوں نے کڑک کر پکارا ۔

''جی...... جی ابّا'' وہ اپنی چال پوری نہ ہونے پر بدحواس تھے ۔

''مجید میاں کے بارہ ہزار روپے بنتے ہیں انھیں لاکر دے دو۔''

مجید بابو اپنی زندگی کے اثاثے کو سینے سے لگائے آنسو بھری آنکھوں سے پرویز شاہ کی طرف دیکھ رہے تھے شکریہ کا ایک بھی لفظ انھیں یاد نہیں آرہا تھا ۔ وہ کپکپاتے قدموں سے اٹھے اور سائیکل تھام کر بڑے پھاٹک سے نکل گئے ۔

تبھی ولایت شاہ نے غُرا کر پکارا

''شہروز میاں''

''جی ابّا'' وہ سعادت مندی سے جُھکے ۔

''اس بار...... پرویز میاں کو بھی حج کراؤ''۔

☆☆☆

کچھ نشان قدموں کے

پاکستان ایرپورٹ پر اترتے وقت ہم سب بے پناہ خوش اور پرجوش تھے۔ ایک عجیب سی مسرت ہم سب کے دلوں میں لہریں لے رہی تھی کافی عرصے بعد ہمارا یہ خواب پورا ہوا تھا اور ہم ساری دوستوں کا گروپ پاکستان کی سرزمین میں اتر چکا تھا۔

ہم سات دوستوں کا یہ گروپ مختلف جگہوں کی سیاحی میں مشغول تھا دارصل ہماری تقریباً ساری ہی ذمہ داریاں پوری ہو چکی تھیں بچوں کی تعلیم شادیاں اور گھر کی تکمیل اب کچھ حق تو ہماری اپنی خواہشوں کا تھا۔ ہم لوگ اپنے پورے گروپ کے ساتھ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی سیر کرتے ہوئے اب پاکستان پہونچ چکے تھے جو کہ اب ہمارا نہیں تھا پھر بھی ہمیں اپنا اپنا سا لگتا تھا۔

ایرپورٹ سے ہوٹل پہونچتے پہونچتے سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے اور ہوٹل پہنچ کر ہم سب اونچی آواز میں اپنی پسند کے شہر دیکھنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ کسی کو کراچی دیکھنا تھا اور

کسی کو لاہور دیکھنا تھا۔کوئی حیدرآباد سندھ دیکھنا چاہتا تھا اور کسی کو ٹکسلا جانے کی پڑی تھی۔

میں نے غور کیا کہ مسز روپا کچھ کچھ خاموش سی ہیں ان کی عمر تقریباً 65 پنسٹھ برس کی تھی وہ ہم سب میں سینیئر تھیں، ہم سب ان کی عزت کرتے تھے دراصل اس گروپ کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی تھی ہم سب تو بیچ میں آ کر ان میں شامل ہوتے گئے۔

میں نے ان سے پوچھا۔'' آپ کون سی جگہ دیکھنا چاہتی ہیں؟ روپا جی؟''

''میں پنڈی جانا چاہتی ہوں۔''

''پنڈی کس طرف ہے یہ کوئی چھوٹا شہر ہے یا پھر کوئی گاؤں؟''

وہ میری نادانی پر مسکرائیں اور بولیں

''میرا مطلب ہے راولپنڈی۔جو لوگ یہاں رہتے ہیں وہ اسے پنڈی ہی کہتے ہیں۔

'' آپ کو کیسے معلوم کیا آپ پہلے آ چکی ہیں۔'' مجھے حیرت سی ہوئی وہ تھوڑی دیر خاموش مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

''میں وہیں پیدا ہوئی ہوں اور وہیں پلی بڑھی ہوں۔''

ان کی آواز بہت نرم اور اداس سی تھی انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ 19 برس کی تھیں تب ان کی شادی ہوگئی اور وہ کیرالہ چلی گئیں اب تو ان کی زبان بھی تامل ہوگئی ہے اور وہ کھانے بھی ساؤتھ انڈین ہی بنانے لگی ہیں جیسے کہ وہ وہاں کے مقامی لوگ بولتے ہیں اور کھاتے ہیں۔مگر وہ ہمیشہ چاہتی تھی کہ ایک بار وہ واپس جائیں۔اپنا بچپن کا ملک اور گھر دیکھیں اور اب جا کر انہیں یہ موقعہ نصیب ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جب ہماری فلائٹ اسلام آباد پہونچی اور ہم سب ایر پورٹ کے باہر آئے تو سردی کی شدّت سے کانپ گئے۔وہاں ایسی سردی تھیں جیسی کہ کسی ہل اسٹیشن پر ہوتی ہے۔روپا کپور نے

ہمیں بتایا کہ یہ شہر بہت بعد میں بسا ہے۔ یہ شہر تقسیمِ ملک کے وقت نہیں تھا۔ پہاڑیوں کو کاٹ کر بسا یا گیا ہے۔ وہاں کی سڑکیں بہت چوڑی تھیں بے حد خوبصورت شاپنگ مال تھے اور بے حد حسین روز گارڈن وہاں کی زینت بڑھا رہے تھے۔ ہم چاہ رہے تھے کہ اسلام آباد میں کچھ دن رک جائیں مگر مسز کپور راولپنڈی جانے کے لئے بے چین تھیں۔راولپنڈی وہاں سے کافی قریب تھا مگر کوئی جانے کے لئے تیار نہ تھا۔

میں نے خود ہی یہ فیصلہ کیا کہ مجھے ان کے ساتھ جانا چاہئے۔وہ بہت زیادہ ایکسائٹیڈ تھیں ۔انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ 46 چھیالیس برس کے بعد اپنا گھر دیکھیں گی۔

میں نے قریب کی فلاورشاپ سے ایک اچھا سا بکے بنوایا اور میں نے ان سے بتایا کہ یہ پھول میں اس گھر کے نئے مالک مکان کو دونگی،ٹھیک ہے؟ وہ مسکرادیں مجھے لگا کہ وہ میرے اس خیال سے بہت خوش ہوگئیں۔

جب ہم ٹیکسی لے کر چلے تو مسز روپا ہمیں اک گائیڈ کی طرح راستہ بتا رہی تھیں۔اک پرانی بلڈنگ کو دیکھ کر انہوں نے بتایا کہ یہ ان کے دوست کنول ساہنی کا مکان ہے اور وہ دیوالی منانے یہاں آیا کرتی تھیں۔پورے راستے وہ مجھے ایک ایک چیز بتا رہی تھیں ایک بہت بڑی جوئیلر شاپ دیکھ کو انہوں نے بتایا کہ بہت چھوٹی سی دوکان تھی ان کے دور کے رشتے دار کی جن کا نام رتن ساگر تھا اور اب شاید یہ ان کے بچے چلا رہے ہوں گے۔

راستے میں ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوئیں۔

''یہ مقبول خان چاچا کی حویلی ہے۔ میں اپنے بچپن میں یہاں بہت کھیلی ہوں بہت بڑا باغ ہے اس حویلی کے پیچھے۔''

وہ اتنی زیادہ خوش تھیں کہ وہ میری طرف دیکھے بنا ہی ساری باتیں کر رہی تھیں وہ کسی بھی

بلڈنگ سے اپنی نظر ایک لمحے کے لئے بھی ہٹانا نہیں چاہتی تھیں شائد وہ یہ سوچ رہی تھیں کہیں یہ منظر پیچھے نہ ہٹ جائے اور وہ دیکھ نہ سکیں ڈرائیور چائے پینے رک گیا تو وہ ٹیکسی سے اتر گئیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر پیدل چلنے لگیں۔ وہ مجھے ایک ایک چپّہ دکھا رہی تھیں............

''یہ دیکھو؟'' انہوں نے ایک دومنزلہ مکان دکھایا یہ میری سہیلی فاطمہ کا مکان ہے،ہم اور فاطمہ یہاں کھیلتے تھے انہوں نے برابر کے پارک کی طرف اشارہ کیا ایک گھر کے سامنے وہ پھر ٹھہر گئیں۔

''تمہیں پتہ ہے۔؟'' وہ میری طرف مڑی اور اشارے سے بتانے لگیں۔ ''یہ اللہ بخش چاچا کا گھر ہے ایک بار مما نے مجھے کھیر کا پیالہ دے کر ان کے لئے بھیجا تھا......'' وہ اک لمحہ رُکیں،

''اچانک اک شخص تیزی سے چاچا کے گھر سے نکلا اور مجھ سے ٹکرا گیا......ساری کی ساری کھیر......گرم کھیر میرے کپڑوں پر گر گئی۔''

''آپ انہیں جانتی تھیں............؟''

''نہیں......اس وقت تو نہیں......وہ مسکرائیں شادی کے بعد اچھی طرح جان گئی ہوں اب وہ میرے شوہر ہیں۔''

ہم ہنستے ہوئے اور آگے بڑھ آئے......وہ بتاتی رہیں......''یہ ڈاکٹر سلیم یہ کاشی دادا...... یہ پھر بھیا......اور یہ ممتاز چاچا کا گھر ہے......''

ڈرائیور گاڑی لے کر پیچھے آ رہا تھا مگر اب وہ ٹیکسی میں بیٹھنے کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر چکی تھیں میں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی چل رہی تھی......اور اچانک وہ رک گئیں......

''یہاں میرا گھر......''

یہ اک موڑ تھا جہاں پر اچھی خاصی پر رونق مارکیٹ تھی بڑی بڑی شاپ، ویڈیو لائبریری اور شاندار ہوٹل چمک رہے تھے۔ انہوں نے رک کر چاروں طرف دیکھا ڈرائیور ٹیکسی روک کر اتر آیا تھا۔

''میڈم۔ آپ کو یقین ہے یہ ہی وہ جگہ ہے......؟''

''ہاں...... ہاں۔ مجھے یقین ہے۔ میں یہاں پیدا ہوئی ہون میں نے یہاں 19 برس گزارے ہیں تم یہاں نہیں پیدا ہوئے ہو۔ (انہوں نے ڈرائیور کو جھڑک دیا)۔ میں غلطی کیسے کر سکتی ہوں......''انہوں نے بے چینی سے ہر طرف دیکھا عمارتوں کے پیچھے جھانکتی رہیں۔ انہیں یقین تھا کہ ان کا گھر یہیں پر ہے شاید ان نئی عمارتوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ ان کی حالت اس بچّے کی سی تھی جس کا نیا کھلونا پسندیدہ کھلونا کہیں کھو گیا ہو......وہ حیران پریشان ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ اور بڑبڑا رہی تھیں

......''ارے میں اپنا گھر نہیں پہچانوں گی میرا گھر...... پتہ ہے ایک بار برامدے میں فرش بن رہا تھا...... یہاں پورٹیکو میں............تو میں دوڑتی ہوئی آئی اور گیلی سمینٹ...... گیلی سمینٹ پر میرے پیروں کے نشان بن گئے اور پھر ڈیڈی نے اس پر سمینٹ نہیں کرنے دیا تھا، انہوں نے کہا یہ روپا کا گھر ہے اور روپا کے پیروں کے نشان اس گھر کی پہچان ہیں۔ بالکل انٹرنس پر میرے پیروں کے نشان تھے تم دیکھنا'' وہ اس نئی بلڈنگ کے باہر بے چین کھڑی تھیں۔

میں نے بڑھ کر چوکیدار سے پوچھا۔''یہ ہوٹل کب بنا ہے۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا کوئی ڈیڑھ دو برس ہو گیا جناب۔

''تم یہاں کب سے کام کر رہے ہو۔''

''بی بی صاحبہ جب سے یہ پرانی بلڈنگ توڑی جا رہی تھی تو میں مزدور تھا پھر یہاں کام مل گیا چوکیدار کا۔''

روپا خاموش رہیں۔

''کیا یہاں پر کوئی پیلے رنگ کا دومنزلہ مکان تھا......؟'' یہ تفصیل روپا مجھے سارے

راستے بتاتی آئی تھیں۔

''جی ہاں یہاں پر اس طرح کی عمارت تھی......کافی پہلے......''

''اور اس کے داخلی دروازے پر پیروں کے نشان بھی تھے'' مجھے بھی بہت بے چینی تھی

''بی بی صاحب وہ تو ہم نہیں جانتے...... جب وہ عمارت توڑی جا رہی تھی تو......''

''چپ رہو......'' روپا زور سے چلّائیں اور ٹیکسی میں جا کر پچھلی سیٹ پر گر گئیں۔

چوکیدار حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''وہ میری دوست کا مکان تھا۔ ہم انڈیا سے آئے ہیں'' میں نے اس کی حیرت دور کی

اور آہستہ آہستہ ٹیکسی کی طرف بڑھی......وہ رو رہی تھیں کانپ رہی تھیں کچھ بول بھی رہی تھیں۔

''یہ میری زمین ہے...... یہ میرا گھر ہے......میرے دادا جی نے بنایا تھا...... یہ میری

روح ہے......میرے اپنے سب یہاں پیدا ہوئے یہیں ان کی موت ہوئی یہ زمین یہ پیڑ یہ ہوا یہ

پانی یہ سب ہمارا ہے۔......بس ایک دن کوئی لائن کھینچ دیتا ہے۔

ایک۔ صرف ایک لائن......ایک سنگل لائن مجھے اجنبی بنا دیتی ہے۔ ایک لکیر ملک کو

کاٹ دیتی ہے......دو ملک بنا دیتی ہے...... مجھے فارنر بنا دیتی ہے میں اپنی ہی زمین پر فارنر ہو گئی،

غیر ملکی ہو گئی۔ کوئی سمجھ نہیں سکتا میرا دکھ میرا درد......'' آنسو ان کے بوڑھے رخسار پر بہہ رہے تھے۔

میں خاموش تھی۔ بالکل خاموش۔ میں نے انہیں تھام لیا تھا وہ کانپ رہی تھیں۔

اور تب میں نے دیکھا کہ وہ پھول جو میں لے کر آئی تھی میں نے بے خیالی میں روپا کی

گود میں رکھ دیئے تھے۔ گھر کی پرانی مالکن کی گود میں پھول مسکرا رہے تھے مگر وہ گھر جس کے داخلی

دروازے پر ان کے قدموں کے نشان تھے وہ اب نہیں تھا......کہیں بھی نہیں تھا......!

دن کی دھوپ آہستہ آہستہ سمٹ رہی تھی ایک اور دن ختم ہو رہا تھا۔

☆☆☆

وجود کا سایہ

اور اس دن میں اپنے آپ سے ملا۔ سڑک پر اکیلا لڑکھڑاتا ہوا۔۔ چہرے پر آنسوؤں کے دھبّے۔۔ میلا یونی فارم۔۔ اور تب تک میں اپنی کار سے ٹکرا کر گر چکا تھا۔

کچھ دیر تک میں اپنے آپ کو کار کی پچھلی سیٹ پر اوندھا لیٹا سسکیاں لیتے دیکھا کیا۔۔۔ اور تب میرا جینے کو جی چاہنے لگا۔۔۔

آیئے میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔

تیز نیلی چنگھاڑتی ہوئی آواز سماعت کو دہکا رہی تھی۔ میں بستہ زمین پر وہیں زینہ کے پاس پھینک کر، پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ گھنٹی بجانے کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔ گھر کے اندر چیخ پکار اور برتن پھکنے کا سلسلہ جاری تھا۔ زور کی بھوک لگ رہی تھی، نیند بھی آ رہی تھی مگر گھر جانے کی ہمّت نہیں تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ سر جھکا کر نیچے کے زینے کی طرف نظر ڈالی تو دیکھا، وہ چہرہ اوپر کئے کھڑی

تھی ،اس کے چہرے پر تشویش تھی۔گول نرم چہرہ دو چھوٹی چھوٹی پونیاں بنائے صاف شفّاف گلابی فراک پہنے ہوئے۔۔شاید ابھی نہا کے آئی تھی۔اس نے اپنا ننھا سا ہاتھ اٹھا کر مجھے بلایا۔مگر میں نے جھنجھلا کر نظریں پھیر لیں۔نیند سے پلکیں بھاری ہو رہی تھی اس لیے دیوار سے ٹک گیا تھا۔

چند لمحوں بعد اس کا نرم سا ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس ہوا۔

"چلو آؤ میرے ساتھ۔۔۔" اس نے میرا بستہ اپنے کاندھے پر ٹانگ رکھّا تھا میں آہستہ قدموں سے غنودگی کے عالم میں اس کے پیچھے چلنے لگا۔

صاف ستھرا چھوٹا سا فلیٹ،محبّتوں کی خوشبو سے معمور۔۔۔۔۔مجھے اپنے میلے کچیلے کپڑوں سے بڑی کوفت ہوئی۔

"تم منہ ہاتھ دھولو۔۔میں کھانا لگاتی ہوں"اس کی امّی نے میرے بکھرے بال اپنی انگلیوں سے سنوارتے ہوئے کہا۔میں کھانا کھا کر وہیں فرش پر سو گیا۔وہ وہیں پر اسکول کا کام کرتی رہی۔

شام کو گھر میں داخل ہوا تو سب بے فکری سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آئے۔بھیّا نے کمپیوٹر سے نظر اٹھا کر ذرا کی ذرا مجھے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

ماں نے جھاڑن لینے کے لئے اسٹور کا دروازہ کھولا اور پھر زور سے بند کیا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے اور بھیّا کے مشترکہ کمرے میں آیا جوتے اتار کر ایک طرف رکھّے۔نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔

شاور کی ننھی ننھی بوندیں جسم کی گرد تھکن اور ذہن کی جھنجھلاہٹ صاف کرتی رہیں۔

اور چند لمحوں کے لئے وہ شام میری اپنی ہو گئی۔۔۔

مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میرے گھر کا ماحول ایسا کیوں تھا؟ماں کسی بوتیک میں کام

کرتی تھی پا پا کا اپنا بزنس تھا، گھر بھی اپنا تھا۔ وہ دونوں بھائی ٹھیک ٹھاک پڑھ بھی رہے تھے۔ بظاہر کوئی کمی نہیں نظر آتی تھی۔ میرا کچّا ذہن یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ لڑائی جھگڑے کی وجہ کیا تھی۔

میں چاہتا تھا میرا گھر بھی ارم کے گھر جیسا ہو جائے، صاف ستھرا موتی کی طرح چمکتا دمکتا۔ جہاں اس کی امیّ روز تازے پھول سجاتی تھیں اور ہمیشہ مسکرا کر ویل کم کرتی تھیں۔ اس کے گھر پر کھانے بھی بہت معمولی ہوتے، کبھی کبھی سلائس جیم کے ساتھ ایک کیلا۔۔۔۔ مگر خوشی خوشی کھا کر تسکین ملتی تھی۔ ارم کی امیّ کبھی مجھے اپنے ہاتھ سے بھی کھانا کھلا دیتی تھیں، سادے سے دال چاول۔۔ وہیں بغیر کارپٹ کے فرش پر پنکھے کے نیچے سکون کی نیند سو جاتا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا، سفید اور گلابی فرش۔ ایک نرم سی مہک۔۔۔

اس کی امّی آہستہ آہستہ اپنا کام کرتیں کہ وہ جاگ نہ جائے۔

نیند بھر کے اٹھتا تو تر و تازہ ہوتا۔ ارم کے ساتھ بیٹھ کر اولٹین کا گلاس ختم کر کے کالونی کے بچّوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے نہ جانے کب شام اتر آتی۔ اپنے گھر جانے کا خوف میرے دل میں ذرد سیّال بن کر دوڑنے لگتا۔

اس دن پھر کھانے کی میز پر ڈیڈی چیخ کر ماں کو ڈانٹتے رہے اور کئی بار ماں چلاّ چلاّ کر اپنا غصّہ اتارتی رہی۔ میرے گلے میں کھانا اٹک رہا تھا، بھیّا میری طرف ہی دیکھ رہے تھے انھوں نے پنیر کا پیالہ میری جانب سرکایا۔

"یہ لو تمہیں تو بہت پسند ہے نا۔۔۔؟"

بے دلی سے بڑھا ہوا ہاتھ راستے میں ہی رہ گیا، ڈیڈی نے پیالہ لے لیا اور کھینچ کر زمین پر دے مارا۔

"نہ نمک کا پتہ اور نہ مصالے کا۔۔۔۔ یہ کتّے کا راتب بنا کر رکھا ہے میرے اور میرے بچّوں کے سامنے۔۔۔۔ جاہل عورت کم از کم ایک وقت کا کھانا تو پیٹ بھر کھلا دیا کر۔۔۔"

ہم حیران فرش پر بکھرے سرخ سالن اور پنیر کے براؤن ٹکڑوں کو تک رہے تھے۔۔۔۔ بھوک چمک اٹھی تھی مگر اب کھانے کی میز پر کیا تھا وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔ میں اٹھ کر تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گیا۔۔ مٹّھی میں آدھی روٹی دبی ہوئی تھی۔ اس کو منھ میں ڈال کر جلدی جلدی نگلنے لگا، آنسو بہہ رہے تھے سسکیاں حلق میں ٹوٹ رہی تھیں۔۔۔ بھوک کی شدّت سے نڈھال نہ جانے کب سو گیا۔

صبح بھی کھانے کے لئے بھی ماں نے کچھ نہیں پکایا، اپنے گنی یا کس سے کچھ روپیے نکال کر اسکول کے لئے باہر آ گیا۔۔

سڑک پر ٹھیلے سے ایک سینڈوچ لیا اور وہیں جلدی جلدی کھا لیا۔ سڑک کے کنارے بنے ہوئے ہینڈ پمپ سے پانی پی کر کچھ سکون ہوا۔ کپڑوں پر نگاہ کی۔۔۔ یونی فارم بہت میلا اور دھبّے دار تھا۔

اسکول جانے کی ہمّت نہیں ہوئی۔۔۔۔ دل میں اک دھواں سا اٹھ رہا تھا۔۔۔۔۔ کہاں جاؤں؟

کالونی کے پیچھے چوکیدار کے کواٹر میں اس کی بیوی کپڑے الگنی پر ڈال رہی تھی، مجھے دیکھ کر مسکرائی تو میں آ گئے بڑھ آیا اور برامدے میں پڑی چار پائی پر بیٹھ گیا۔

" کا ہوا بٹوا؟؟؟ اسکول سے بھاگ آئے ہو کا؟؟؟؟"

میں کچھ بول نہیں سکا بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ میرے لئے اندر سے ایک لسّی کا گلاس لے آئی۔ میں گلاس تھام کر جلدی جلدی لسّی پینے لگا۔۔۔ اور وہیں پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ حیران تھی پھر ایک چادر لیکر آ گئی

"رُک جاؤ بھیّا۔۔۔تنی چادر بچھائے دئی۔۔۔"

" نہیں رہنے دو" چادر اس کے ہاتھ سے لے کر سرہانے رکھ لی اور گہری نیند

سو گیا۔۔۔جانے کب تک سوتا رہا

اٹھا تو شام ہو رہی تھی ۔چوکیدار کرسی پر بیٹھا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

بستہ اٹھا کر بغیر کچھ کہے میں گھر کی جانب چل پڑا۔

زینہ پر وہ پریشان کھڑی تھی۔

"تم کہاں تھے دن بھر؟؟؟

اس کے لہجہ میں فکر بول رہی تھی۔

" کچھ تو بولو۔۔اسکول کیوں نہیں آئے۔۔۔؟"

میں نے سر اٹھا کر زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔۔۔

" تھوڑی دیر کے لئے تمہارے گھر آ جاؤں؟؟"

اس نے آگے بڑھ کر تپتا ہوا ہاتھ تھام لیا اور اپنے گھر لے آئی۔

وہاں اس کے پاس بیٹھ کر میں اپنے طریقے سے اپنے دُکھ سناتا رہا۔۔۔وہ میرا چہرہ اپنے تولیہ سے صاف کر کے آئسکریم نکال لائی۔۔پھر اپنی تصویروں بھری کتابیں دکھاتی رہی اور اس نے ایک ڈائری کھول کر ایک ننھا سا تتلی کا پر دکھایا۔۔۔کئی رنگوں سے سجا وہ پر۔۔۔بیحد خوبصورت تھا۔ نظرون میں پسندیدگی دیکھ کر اس نے ایک گلابی لفافے مین وہ پر رکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ تمہارے لئے ہے۔۔۔اب مت رونا۔۔۔میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔۔۔"

اور وہ پر میری زندگی کا قیمتی اثاثہ بن گیا۔

تعلیمی مدارج طے کرتا رہا۔ ہوسٹل بھی رہا اور عزیزوں کے ساتھ بھی مگر وہ پر میرے

ساتھ ساتھ رہا۔

زندگی کئی برس آگئے بڑھ آئی۔ دہلی میں ایک اچھا فلیٹ لے کر میں واپس اپنوں سے ملنے بھی گیا ،سوچا تھااس گلابی پرَ کی طرح اپنی زندگی بھی گلابی ہوجائے گی مگر۔۔۔وہاں بھی قسمت سے ہار گیا۔

میں نے جھک کر بالکونی میں رکھّے اپنے پیار سے لگائے ہوئے پھولوں کو دیکھا ، گہرے ہرے کنارے پیلے پڑ گئے تھے۔۔۔گرد وغبار سے پودے نڈھال اور بے رونق ہو چکے تھے۔میں تڑپ اٹھا۔۔۔پانی کا پائپ لے کر سارے پودوں کو شفّاف کرنے میں جٹ گیا۔۔۔دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس گلُ داؤدی کے پودے کو لے کر میں زاروقطار رو رہا تھا۔۔

"سوری دوست۔۔۔ویری سوری۔۔۔میں بہت خودغرض ہوگیا تم کو بھول گیا تھا۔۔۔اپنے غموں میں ایسا جکڑ گیا کہ تمہارا احساس بھی نہ کر سکا۔۔۔میرے دوستو۔۔۔ایک ایک پودے سے معافیاں مانگ رہا تھا کوئی مجھے دیکھتا تو پاگل ہی سمجھتا۔

مگر میں جانتا تھا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔یہ پھول پودے یہ بے زبان ہمیشہ میری اُداسی دور کرتے رہے اور اب میں ان کو بھول کیسے گیا؟

یہ غم ساری دنیا پر محیط کیوں ہوگیا۔۔۔۔

ارم کی شادی ہوگئی تھی بس یہ خبر برداشت کرنا میرے لئے سخت عذاب تھا۔سارے خواب ایک چھناکے سے ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔۔۔

کمرے میں آ کر میز پر رکھّی ڈائیری کھولی تو ہتھیلی پر ننھا سا گلابی پر کپکپانے لگا۔۔

آنسو بے آواز گرتے رہے۔۔۔تھوڑی دیر یوں ہی کمرے میں بے مقصد گھومتا رہا۔۔شام کمرے کے باہر ٹہل رہی تھی۔کھڑکی بند کر کے پردے گراتے ہی اے سی کی ٹھنڈک اثر انداز ہونے لگی اور میں بے خبر سو گیا۔۔۔

خوابوں میں ارم کا گھر، اس کے گھر کا سکون اور اس کی ماں کی شفقت مجھے بہلاتے رہے۔

صبح روز سے زیادہ روشن تھی۔ ہلکا اجالا پھیل رہا تھا تب ہی وہ اٹھ کر باہر نکل آیا سرسبز پودے خوشی سے جھوم رہے تھے، فضا میں خنکی باقی تھی۔۔گُل داؤدی کے پتّے گہرے ہرے ہو گئے تھے اور اُن پتّوں سے ننھی سی گلابی کلی شرما کر جھانک رہی تھی۔

میری ساری کلفت دور ہونے لگی۔۔۔۔سارا دکھ سارا غصّہ ساری کوفت ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔۔۔میں مسکرایا، گھٹنوں کے بل بیٹھا اور ان پتّوں پر ہاتھ پھیرا۔۔سامنے کی بالکونی میں دیکھا تو بھیا جی ایکسر سائیز کرتے نظر آئے۔۔مجھے دیکھتے ہی مسکرائے اور خوشدلی سے بولے۔

"ہیلو جی۔۔۔کہاں رہے اتنے دن؟ بڑے دنوں بعد شکل دکھائی ہے کیا پتہ کہ میں اس کمرے میں رہ کر بھی یہاں نہیں تھا۔۔۔

"بس ایسے ہی جناب۔۔۔آؤں گا، ملوں گا کسی دن۔۔۔ایک کام بھی تھا آپ سے۔۔"

"ہاں جی بولو۔۔۔آپ جیسے پڑوسیوں کے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔۔حکم کرو۔۔"

"ارے نہیں صاحب۔۔۔اپنی جان ہی نہیں سنبھلتی۔۔۔" میں ہنس پڑا۔

"اب کہیں جاؤں گا تو میرے پودوں کی دیکھ بھال آپ کے سپرد۔۔۔۔آپ کی بالکونی میں رکھ دوں گا۔۔۔اگر آپ کو بُرا نہ لگے۔"

"تُسی فکر ہی نہ کرو۔۔یہ تو اپنے بچّوں جیسے ہیں۔۔اور آپ کے پودے تو ہمارے مہمان گھر مہمان ہوئے نا۔۔۔۔ہماری تو بالکونی سج جائے گی جی۔۔"انھوں نے حسب عادت زوردار قہقہہ لگایا۔

میرے دل کا بوجھ اتر گیا۔

ان بے کراں خیالات کے سمندر میں تیرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ بھی نہ ہوا کہ میرے ہاتھ اسٹیرنگ پر بہک رہے ہیں۔اچانک ایک جھٹکے سے میں نے گاڑی روک دی سڑک پر لوگ

جمع ہونے لگے تھے۔میں گھبرا کر نیچے اتر آیا۔۔۔ایک بچہ اگلے پہیئے کے پاس اوندھا پڑا ہوا تھا۔۔ایک خوف ناک خیال نے مجھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا میں نے کانپتے ہاتھوں سے اس بچّے کو سیدھا کیا، اس کو کچھ خاص چوٹ نہیں آئی تھی وہ شاید خوف سے گر گیا تھا۔۔۔اسے سہارا دیکر گاڑی کے اندر بیٹھانے تک میں نہیں سمجھ سکا کہ میں کیا کروں گا۔۔۔۔

بچّے کے گھٹنے پر دوا لگا کر میں نے اسے پانی پلایا۔

" کہاں جاؤ گے میں چھوڑ دیتا ہوں"

وہ سہمی نظروں سے مجھے تکنے لگا۔۔۔پھر دھیرے سے بولا" کہیں۔۔نہیں۔۔۔کوئی گھر نہیں ہے میرا۔۔۔کہاں جاؤں گا۔۔۔مجھے پتہ نہیں"

میرے سامنے میرا بچپن پوری جزّیات کے ساتھ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔

بچّے نے بتایا اس کے ماں باپ حادثے کا شکار ہو گئے۔۔چا چا نے گھر پر قبضہ کر کے اسے نکال باہر کیا۔۔۔

وہ دھکّے کھاتا ہوا بھوکا پیاسا نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔۔۔اور اب۔۔۔

اب میری باری تھی۔۔۔مجھے محسوس ہوا میں ایک بار پھر اس درد کے سمندر کو پار کرنے نکلا ہوں۔۔۔۔

میں نے اپنا محبّت بھرا ہاتھ بچّے کے سر پر رکھ دیا اور اب ہم دونوں گہرے دوستوں کی طرح زندگی سے نپٹنے کے لئے تیّار تھے۔

☆☆☆

صدیوں نے سزا پائی۔۔۔

کئی برس گزر گئے میں اِس حویلی کے پیچھے والے باغ میں کھڑا ہوں اور بچپن سے اس جگہ کی سرگرمیاں دیکھ رہا ہوں۔ جب میرا قد چھوٹا تھا تو اچک اچک کر حویلی کے آنگن میں جھانک لیا کرتا تھا۔ایک خوبصورت ،چمکتی دمکتی لہراتی ،قہقہے لگاتی دلہن کو دیکھا تھا میں نے۔۔۔۔۔جب وہ لہرا کر چلتی تو اس کی پازیب چھن چھن بولتی ،یہ مدھر آواز پوری حویلی میں گونج جاتی۔۔۔کتنی بےفکر زندگی تھی۔۔۔اس کی بھی اور میری بھی۔۔۔

تھوڑا لمبا ہوا تو میرے احساسات بھی بدل گئے۔اِن خوشبودار پتّوں میں جب ہوائیں سرسرا کر مجھے گدگداتیں تو ایک سرور کا احساس ہوتا میں لہراتا۔۔۔۔اور لہراتا۔۔میرے لمبے اور نرم بازواب کبھی حویلی کی چھتوں تک پہنچ جاتے۔

،یہاں کئی بزرگ بھی ہیں مگر وہ زیادہ خوش نہیں رہتے۔۔۔جیسے میں رہتا ہوں۔۔۔ہمیشہ

خوش۔۔۔ہلکی آواز میں گنگنا تا۔۔۔جھومتا۔۔لہرا تا۔۔۔۔۔دل چاہتا کہ ان سے پوچھوں۔۔آپ خوش کیوں نہیں۔۔۔۔۔اتنے افسردہ کیوں رہتے ہیں؟

مگر وہ مجھے منھ کہاں لگاتے۔۔۔مجھ سے بڑے اور تجربےکار ہیں۔۔بقول ان کے دنیا دیکھی ہے۔۔۔تو میں اس نئی نویلی دلہن کی ہنسی اور پازیب کی جھنکار سن کر مسرور ہوجاتا۔۔۔۔میرے اندر شگوفے پھوٹنے لگتے۔

صبح صبح جب اندھیرا پوری طرح ختم بھی نہ ہوتا، میں اٹھ جاتا۔اپنے پیدا کرنے والے کی حمد وثنا کرتا،اس کا شکرادا کرتا جو مجھے رزق دیتا ہے جو ہواؤں اور بارش سے مجھے سیراب کرتا ہے جو دھوپ میں میری پرورش کرتا ہے،وہ مجھے دیکھتا سنتا اور سمجھتا بھی ہے۔میرے بزرگوں نے مجھے عبادت کرنا سکھایا مجھے بے حد سکون ملتا ہے جب خاموش ہوکر سنّاٹے میں اس کو یاد کرتا ہوں۔

اذان ہوتے ہی وہ نئی نویلی دلہن بھی بیدار ہوجاتی ہے۔وضو کرتی تو اس کی چوڑیاں اور کنگن کھنکتے۔۔اس کی دبی دبی ہنسی تب بھی سنائی دے جاتی۔بہت کوشش کرتا کہ اسے دیکھ لوں مگر ان آوازوں پر ہی گزارا کرلیتا۔

جب کوئی مہمان آتا اور باغ کی طرف والا دروازہ کھولا جاتا اور وہ انھیں سواری سے اتارنے کے لئے ہنستی کھلکھلاتی آکھڑی ہوتی۔۔۔پھر سب سے گرم جوشی سے گلے ملتی،تب اس کو بہت دیر تک دیکھتا رہتا۔۔۔اس کے لمبے گھنے کالے بال جو دوپٹے کے اندر سے کمر تک جاتے دیکھائی دیتے،اس کا چمکتا دمکتا گلاب چہرہ اندرونی خوشی سے تمتمایا رہتا لمبا قد بھرا بھرا جسم،اس کی جگمگاتی خوبصورت کالی آنکھیں سرخ ہونٹ۔۔۔

کئی دن تک اسی سرور میں رہتا تھا۔

شام ہوتے ہوتے چراغ جل جاتے۔باغ میں بڑے سے حوض کے چاروں طرف

قندیلیں روشن ہوجاتیں۔ ہر جانب نرم اور مدھم سا اُجالا پھیلنے لگتا۔تب میں باغ کے پاس والے کمرے سے دبی دبی ہنسی کی آوازیں سنتے سنتے سوجایا کرتا۔

راجہ لوگوں کی بڑی باتیں۔۔دروازے پر دو ہاتھی کھڑے رہتے ،گھوڑوں کے اصطبل سے کئی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آتی رہتیں ،لوگ باتیں کرتے جس سے پتہ چلتا کہ کئی رنگ ونسل کے گھوڑے وہاں موجود ہیں۔

راجہ صاحب کبھی ہاتھی اور کبھی گھوڑوں پر سیر کو نکلتے۔ان کے جاتے وقت جب نئی دلہن ان کے بازو پر ستاروں بھرا امام ضامن باندھتی تو اس کی ہنسی رُک جاتی۔اس کے ہونٹوں پر دعائیں لرزنے لگتیں۔آنکھیں نم ہونے لگتیں ،راجہ صاحب اس کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر بہلاتے۔تب میں دعا کرتا کہ وہ کبھی کہیں بھی نہ جائیں نئی نویلی دلہن کی پلکیں کبھی نہ بھیگیں۔وہ باغ والے کمرے کی چوکھٹ پر بیٹھ کر پتّے مٹھیّوں میں بھر لیتی ، مجھے لگتا ان مٹھیّوں میں میرا دل دھڑک رہا ہے،وہ اپنی ہتھیلیاں ناک کے پاس لیجا کر خوشبو اپنی سانسوں میں اتارتی ،تو میرا دل ناچنے لگتا۔نرمی بڑھنے لگتی خوشی کے فوّارے سے پھوٹتے اور اس کی آنکھیں خوبناک ہوجاتیں۔

مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔اس کی شادی کو پانچ برس کا عرصہ گزر گیا تھا،ہنسی کی آواز اب شاذ و نادر ہی سنائی دیتی۔اندر سے بڑی رانی صاحبہ کی سرگوشیاں بڑھ گئی تھیں۔اس خوبصورت رانی دلہن کو اولاد کے طعنے ملنے لگے تھے۔جسے سنکر وہ باغ والے کمرے میں آکر گھنٹوں درختوں پھولوں اور حوض کے شفّاف پانی کو تکتی رہتیں شاید دل ہی دل دعائیں کرتی ہوں گی۔اللہ کو کیا منظور تھا یہ کون جان سکتا ہے۔

میں نے ایک دن اپنے بزرگ سے بات کرنی چاہی، دراصل وہ آپس میں بات کرتے

تو مجھے تجسّس ہونے لگا تھا۔ان لوگوں کی باتوں میں مجھے پڑ اسرار سرگوشیاں سنائی دیتیں۔وہ باتین راجہ صاحب کے دادا کے بارے میں تھیں۔جن کو اولاد نہ ہونے کی بد دعا ملی تھی۔

ان کے ایک ہی بیٹے تھے جو اِن راجہ صاحب کے والد تھے،ان کے باقی دونوں بچّے عالمِ جوانی میں ختم ہو گئے۔۔۔بس ایک یہی تھے جو سارا انتظام دیکھ رہے تھے۔

پرانے قصّے کیا تھے وہ میں سمجھ نہیں پاتا تھا۔۔۔مگر اپنے برابر والوں یہی سنا تھا کہ بد دعا زبان سے نہ بھی دی جائے تو دل سے نکل کر عرش پر پہونچ جاتی ہے،کچھ لوگوں کے ساتھ اس قدر ظلم ہوا تھا کہ وہ گھر سے بے گھر کر دیے گئے اور تو اور وہ ان کے اپنے سگے بھائی تھے،معصوم تھے اپنی اور اپنے بچّوں کی جان بچانے کیلیئے وہ دردر بھٹکنے پر مجبور ہوئے تھے۔

یہ ساری باتیں اکثر بزرگ کرتے رہتے تھے،مجھے ان کی باتوں سے ڈر محسوس ہوتا،کئی دن سہما رہتا تھا۔بڑی رانی صاحبہ اپنے خدمت گاروں پر بہت ظلم کرتیں،کڑی دھوپ میں ان کو ننگے سر اور ننگے پیر کھڑا رہنے کا حکم دے دیتیں۔ایکبار تو میں نے خود دیکھا تھا کہ انھوں نے اپنی خادمہ کے ہاتھ پر جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا تھا جس سے اس کا ہاتھ مدتوں زخمی رہا تھا وہ نوکروں کو غصّے میں عجیب وغریب سزائیں دیتی تھی۔کسی کے ہاتھ کو جلاتیں،کسی کے ہاتھوں کو بھاری بھرکم مسہری کے پائے کے نیچے دبا دیتیں اور اس پر دوسری لحیم شحیم عورت کو کھڑا ہونے کا حکم دیتیں۔۔۔ان کی آواز سے سارے خادم کانپتے تھے۔۔۔۔

ایک دن اچانک جب باغ والے دروازے پر گاڑی آکر رکی تو مجھے ایک بچّے کے رونے کی آواز آنے لگی۔۔رانی دلہن کی گود میں ایک ننھا سا وجود دیکھ کر میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔حویلی میں اچانک رونق اور چہل پہل دکھائی دینے لگی لوگ بھاگ دوڑ کر رہے تھے غریبوں میں کپڑے بانٹے جا رہے تھے،صدقے دیے جا رہے تھے۔رانی دلہن کی ہنسی کے فوّارے چھوٹ

رہے تھے۔مگر بڑی رانی صاحبہ کی سرگوشیوں کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

''یہ ہمارا خون نہیں ہے، بیوی کی باتوں میں آ کر نہ جانے کسے اٹھا لائے ہیں"

حویلی سجائی گئی تھی رشتہ دار عزیز سب تہنیت دینے آئے ہوئے تھے۔کچھ خفا اور کچھ خوش نظر آ رہے تھے۔مگر بچّہ ایسا تھا کہ سب کو پیار آ رہا تھا۔۔۔اور تو اور جب وہ سرخ کپڑوں میں ننھی سی ٹوپی لگائے ہمک کر بڑی رانی کہ طرف آیا تو انھوں نے بھی گود میں لے کر کلیجے سے لگا لیا۔

وہ گول مٹول پیارا سا بچّہ جس کی صورت یہاں کسی سے نہیں ملتی تھی، وہ اپنی شکل آپ تھا۔

جب کچھ بڑا ہوا اور باغ میں کھیلنے آنے لگا تو میں سفید پھول اور نرم پتّے اس پر نچھاور کرتا۔۔۔رانی دلہن دوڑ کر اس کو پکڑتی اور وہ کھلکھلا کر میرے سائے میں دوڑتا بھاگتا۔۔۔کبھی حوض کے کنارے کبھی کسی درخت کے نیچے اور کبھی آ کر مجھ سے لپٹ جاتا۔۔۔۔مجھے بہت سکون سا محسوس ہوتا تھا۔۔

حویلی کے حالات بدلنا شروع ہو گئے تھے۔

ہاتھی تو کب کے دروازے سے غائب ہو گئے تھے اور اب گھوڑے بھی کم ہو گئے، راجہ صاحب نے جیپ خرید لی تھی وہ اکثر شام کو بچّے اور اپنی دلہن کے ساتھ باہر گھومنے جاتے وہ ہنستی مسکراتی اپنے آپ کو بڑی سی گلابی چادر میں لپیٹ کر، بچّے کو سینے سے لگائے جیپ میں آ کر بیٹھ جاتی۔باغ کا دروازہ کھول دیا جاتا اور جیپ باہر نکل جاتی۔۔۔میں اپنے سفید پھول ان پر وار دیتا اور ان کی دائمی خوشیوں کی دعا کرتا۔

وقت رکتا نہیں وہ تو بہے جاتا ہے ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا میں آرام سے سویا ہوا تھا ،اک چیخ سے میری آنکھ کھُل گئی۔

میں نے گھبرا کر حویلی کے اُوپر سے جھانکا تو روشنیوں کو اِدھر اُدھر جاتے دیکھا، سب

کے پریشان چہرے دیکھے۔ وہ اس حویلی میں راجہ صاحب کا آخری دن تھا۔۔۔۔وہ کئی دن سے بیمار تھے اور پھر نہ جانے کیا کیا ہوا۔۔رانی دلہن کی چوڑیوں کے ٹوٹنے سے میں لہولہان ہوگیا، تن بدن میں خراشیں پڑ گئیں، ان کا سرخ چمکتا دوپٹہ اُتار کر سفید سوتی چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ وہ حویلی کے صحن میں بچّے کو سینے سے لگائے سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ میرے اندر گرم گرم سیّال سا ابل رہا تھا مگر میں رو نہیں سکتا۔

پھر موسم بدلنے لگا تیز آندھیاں آتیں ڈھیروں سوکھے پتّے حویلی کے آنگن میں اور باغ والے کمرے کے سامنے بکھر جاتے۔ کام کرنے والے کم ہو گئے تھے۔۔۔کئی کئی دن صفائی نہ ہوتی۔ پتّے یونہی ادھر اُدھر اڑتے رہتے۔

بزرگ اب جھکنے لگے تھے ان کی زبانی بہت کچھ سنا میں نے، انھوں نے یہاں کے بہت سرد و گرم دیکھے، بددعا تو عرش کے پائے ہلا دیتی ہے نہ جانے کتنا ظلم ہو چکا تھا، جس کا خمیازہ اب یہ معصوم بھگت رہے تھے۔ وہ ظلم و زیادتیاں پرانے درختوں نے دیکھی تھیں اسی لئے وہ کبھی نہیں ہنستے تھے۔ ان کے اندر دکھ کی دیمک لگ چکی تھی۔ انھیں نہ ٹھنڈی ہواؤں سے سرور آتا اور نہ پانی کی بوندوں سے گدگدی محسوس ہوتی۔ ایک دربان کی طرح حویلی کی اوٹ میں کھڑے کھڑے بوڑھے ہو رہے تھے۔

میں بھی اب تھکنے لگا تھا۔ میری باہیں بھاری ہو کر بوجھ بن گئی تھیں۔ بزرگ بھی کم ہو گئے تھے۔

رانی دلہن اب بوڑھی ہونے لگی تھیں۔ بڑی رانی بھی چل بسی تھیں۔۔۔۔وہ بہت تکلیف اٹھا کر گئی تھیں سنا تھا ان کے سارے جسم پر آبلے پڑ گئے تھے، کسی دوا سے آرام نہ تھا۔۔۔وہ تڑپتی رہتی تھیں۔ ان کی دلخراش آوازیں مجھے سہما دیتی تھیں۔۔۔

وقت اور آ گئے بڑھ آیا۔ وہ بچہ بڑا ہونے لگا تھا، اس کی تعلیم کے لئے نئی دلہن نے بہت کوششیں کیں مگر ناکام رہیں۔۔وہ اپنا اثاثہ فروخت کرتا رہتا تھا۔اس بات سے گھر میں کافی تکرار رہتی۔

انسانوں کے جنگل کی یہ عام بات ہے۔خون چوس کر الگ ہوجانے والی جوکوں نے ان کو گھیر لیا تھا۔اور چھوٹے راجہ ان لوگوں کے لئے ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھے۔

وہ رانی دلہن کی کسی نصیحت پر کان نہ دھرتا، اپنا اقتدار واپس پانا چاہتا تھا مگر اب زمانہ بدل چکا تھا حکومتیں بدل چکی تھیں، وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

تیز آندھیوں مین کئی درخت زمیں بوس ہو چکے تھے۔۔۔ان کی لکڑی کاٹنے کی آواز میرے اندر خراشیں ڈالتی تھی۔

میری سماعت رانی دلہن کی آواز کو ترستی تھی۔تب ایک دن وہ پھر ہنس رہی تھیں۔۔۔آنسوؤں میں بھیگی ہنسی سے درو دیوار سج رہے تھے، اپنی جیسی سرخ کپڑوں میں لپٹی ایک نازک سی دولھن ان کے بازوں میں تھی، چھوٹے راجہ کی دلہن آ گئی تھی۔

میں نے بھی اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر اسے خوش آمدید کہا۔ کچھ نرم پتّے اس پر نچھاور کئے۔۔۔کچھ دنوں تک حویلی میں گہما گہمی رہی، باغ والے کمرے کا دروازا کئی بار کھلا۔۔رانی دلہن نے کئی مہمانوں کو خوشی خوشی سواری سے اتر وایا اور پھر شادی کے بعد رخصت بھی کیا۔ان کی پرانی چال جیسے لوٹ آئی تھی وہ بے پناہ خوش تھیں۔مگر کچھ دنوں بعد پھر وہی خاموشی سی چھا گئی نئی دلہن اکثر میکہ میں رہتیں۔

باغ والے حوض کے کنارے اب قندیلیں نہیں جلتی تھیں، اندھیرا ہی رہتا۔حوض کا پانی بھی نہیں بدلا جاتا تھا پہلے جب رانی دلہن اپنے راجہ صاحب کے ساتھ شام کی چائے وہاں پیتیں

تھیں تو حوض کا شفّاف پانی ہلکورے لیتا، ایک ٹک ان دونوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ مگر اب اس گدلے پانی میں جھرّ یاں پڑنے لگیں تھیں۔

کبھی کبھی دن بھر کی تھکی چڑیاں وہاں بیٹھ کر ہاتھ منھ دھولیتیں، گھونٹ بھر پانی پی کر پھُر پھُراتی ہوئی آسمان کی وسعتوں میں کھو جاتیں۔

رانی دلہن کو اب کم دکھائی دینے لگا تھا۔ جھریّوں بھرا چہرا لئے کبھی کبھی آنکھوں پر انگلیوں کا چھجّا سا بنا کر صحن کے کونے سے مجھے دیکھتیں۔ شاید وہ مجھے پہچانتی تھیں۔ باغ والے کمرے کا دروازہ کھول کر اکثر خاموش کھڑی رہتیں۔۔۔۔

شاید ان کے رنج کا ساتھی میں ہی تھا۔۔۔۔

کم علمی کی وجہ سے ان کا بیٹا ٹھوکریں کھاتا اور وہ تڑپتیں

ایک روز جب یہ خبر آئی کہ شہر کی ساری جائیداد پر کچھ لوگوں نے زبردستی قبضہ کرلیا ہے تو وہ سنبھل نہ سکا۔

اس دن بہت تیز آندھی آرہی تھی، میں بار بار خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس آندھی کے شور میں اچانک کئی شور شامل ہو گئے۔

وہ بچّہ جو رانی دلہن کی گود میں پلا تھا، اپنا دل نہ سنبھال سکا اپنی ننھی سی بچّی کو اپنی دلہن کی گود میں چھوڑ کر لڑکھڑایا اور اچانک ڈھے گیا۔

آندھیوں کا شور بڑھ گیا۔۔۔ سارے پتّے میرا ساتھ چھوڑ گئے۔۔۔۔ رانی دلہن کی چیخیں میرے اندر خراشیں ڈال رہی تھیں چھوٹی دلہن کے آنسو مجھے تڑپا رہے تھے۔ ان کا درد ساری کائنات پر پھیل رہا تھا۔ ان کے دونوں ہاتھ خالی تھے، دل خالی تھا۔۔۔ میں کیسے برداشت کرتا۔۔۔ ایک چیخ سنی اور پھر کچھ یاد نہیں رہا۔

کیوں کہ میں تو یوکلپٹس کا پیڑ ہوں اور آج میری شاخیں کلہاڑی سے کاٹ کر باغ والے کمرے کے سامنے سے ہٹائی جا رہیں ہیں میں وہاں چت پڑا ہوں میرے بدن پر آریاں چل رہی ہیں اندھیرے میں ڈوب رہا ہوں۔۔۔۔انجانے میں اس بد دعا میں میں بھی شامل ہو گیا جو گھر والوں کے لئے تھی۔۔اندھیرا گہرا اور گہرا ہو گیا۔۔۔

☆☆☆

پکّا۔۔۔۔

ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ تھا وہاں۔۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔۔۔ بہت چھوٹا ایک نقطہ سا۔۔ جہاں نمک کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔۔اناج اور سبزیاں کھیتوں میں اگائی جاتی تھیں، پانی کوئیں سے گھڑوں میں بھر کے رکھا جاتا تھا۔

وہاں اس برگد کے نیچے ایک اینٹوں کا چبوترا تھا جسے سیمنٹ لگا کر جوڑ دیا گیا تھا، اسے گاؤں کے لوگ ''پکّا'' کہتے تھے۔اس پر صبح شام مزدور آ کر بیٹھتے تھے اور اکثر بچّے کھیلا کرتے اور ان بچّوں میں میں بھی شامل تھی۔

وہیں ایک بزرگ آ کر بیٹھتے تھے۔ سارے مزدور اور کاشتکار اپنی مشکلیں انھیں سناتے اور ان سے رائے لیتے۔۔۔وہ سبکی بپتا سنتے اور اکثر ان کا حل بھی بتا دیتے تھے تمام محنت کش پریشانیوں کی گٹھری وہیں چھوڑ کر، ہلکے ہلکے پھلکے ہو کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ وہ سارے لوگ ان بزرگ کو بہت

ساری دعائیں دے جاتے تھے۔

مجھے یہ بھیڑ بھاڑ اچھی نہیں لگتی تھی تو اکثر ان سے پوچھتی ''آپ کیوں سنتے ہیں سب کی باتیں۔۔۔؟'' مجھے ملال ہوتا۔۔ وہ اتنی دیر تک اس طرح کے لوگوں میں کیوں گھرے رہتے ہیں۔

''بیٹا۔۔۔'' وہ آہستہ آہستہ مجھے سمجھاتے۔ ان کی انگلیوں میں تسبیح لے دانوں کی گردش رک جاتی۔۔۔''وہ لوگ مجھے اپنی الجھنیں پریشانیاں کچھ دیر کے لئے ہی سہی۔۔۔دے دیتے ہیں ان کا بوجھ چند لمحوں کے لیئے ہی سہی۔۔۔۔کم ہو جاتا ہے، ان سب کی زندگی کئی امتحانوں سے گزر رہی ہے بیٹی۔۔اگر کچھ دیر کے لئے ہی میں ان کو سکون دے سکوں تو یہ اللہ کی عنایت ہے مجھ پر۔۔۔۔''

میں ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔۔۔تو اک نور کا ہالا ان کے چہرے کے آس پاس نظر آرہا تھا۔۔۔اور وہ نور کا ہالہ دن بدن روشن ہوتا گیا

۔اب زندگی ان کے بغیر گزار رہی ہوں تب بھی وہ نور کا ہالا میرے ارد گرد ہے اور اسی سے زندگی کی ہر جدّ وجہد کا سامنا بھی کر رہی ہوں۔زندگی کے مسائل۔۔۔حوادث۔اور جدّ وجہد کس کے ساتھ نہیں ہوتے۔ وقت کی آندھی سوکھے پتّے کی طرح اڑائے اڑائے پھرتی رہی۔کبھی پڑھائی کی فکر کبھی نوکری۔۔اور کبھی اپنی ازواجی زندگی کے اتار چڑھاؤ۔۔یہ کسی ایک کا مسئلہ نہیں عام طور سے سبھی اسی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔

بہر حال میں جس کمپنی میں ہوں وہیں نتاشہ بھی کام کرتی ہے۔پہلی بار جب میں نے اسے دیکھا وہ مجھے اچھّی لگی۔۔ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔۔۔اور دوستی کی ابتدا ہو گئی۔ دوستی کے لئے تو خیر کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔۔۔یہ تو ایک کشش ہے جو آپ کو خود بخود کسی ہستی کی طرف مائل کر دیتی ہے۔۔۔خیر بات نتاشہ کی ہے ہم آفس میں ایک دوسرے سے ملتے اپنی باتیں اپنی پریشانیاں بھی شیئر کرنے لگے۔۔کبھی کافی کبھی لنچ۔۔۔ساتھ ہونے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ آفس کے کافی

لوگ اس سے زیادہ قریب ہیں۔۔وہ زیادہ خوبصورت تھی سب سے ہنس کر ملتی تھی۔۔۔میری طرح لیئے دیئے نہیں رہتی تھی۔ یہ شاید جلن کا احساس تھا یا احساس کمتری۔۔میں اس سے دور ہونے لگی۔ میں اس سے بلا وجہ خفا رہنے لگی۔مگر وہ اسی طرح مخلص مسکراہٹیں بکھیرتی میرے کیبن میں آجاتی۔ کبھی کافی لے کر اور کبھی یونہی ہنستی مسکراتی آ کر بیٹھ جاتی۔ایک دن میں پھٹ پڑی۔'

'تم اپنے گرد جو میلہ لگائے رکھتی ہو۔۔مجھے اچھا نہیں لگتا،تمہاری سیٹ کے پاس مستقل لوگ رہتے ہیں وہ لڑکیوں ہوں یا مرد۔۔ہر کسی سے ہنس کر باتیں کرتی ہو۔۔ہمارے سماج میں یہ سب اچھا ہے کیا۔۔؟ بہتر ہوگا کہ۔۔۔'' وہ ہنسنے لگی۔۔جیسے کوئی بڑا کسی بچّے کی بے تکی بات پر ہنس پڑے۔۔'

'تم کیا سمجھتی ہو۔۔ وہ سب میرے حسن کے قصیدے پڑھنے آتے ہیں۔۔؟ وہ جو میرے اردگرد ہوتے ہیں وہ صرف اپنے مسائل سنانے آجاتے ہیں اور میں صرف ان کی باتیں یکسوئی سے سن لیتی ہوں۔۔۔ورنہ کس کے پاس وقت ہے؟؟ کہ کسی کہ الجھنون کو سنے؟ مناسب رائے بھی دے دیتی ہوں جو بھی مجھ سے ممکن ہو اس مدد کو بھی تیّار رہتی ہوں۔۔کچھ دیر کو ہی سہی۔۔انھیں اپنی پریشانیوں دکھوں سے نجات مل جاتی ہے۔۔۔میری سیٹ کے پاس آ کر ہی سہی۔۔'' وہ خاموش ہوئی ۔۔اور میںنے دیکھا۔۔ایک نور کا ہالہ اس کے چہرے کے چاروں طرف روشن تھا۔۔ یہ چمک لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔۔۔تب مجھے ایک بات سمجھ میں آئی کہ۔۔۔ پکّہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔۔۔اسکول میں گھر میں۔۔برگد کے نیچے یا آفس میں۔۔۔کہیں بھی۔۔۔۔!

☆☆☆

ایک پیالی چائے۔۔۔۔۔

کبھی کبھی کوئی نام زہن سے نکل جاتا ہے اور ہم سوچتے رہ جاتے ہیں بہت کوفت ہوتی ہے۔۔۔مگر نام یاد نہیں آتا۔ان کا نام نہ تو زہن سے نکلا ہے اور نہ بھول سکتی ہوں۔زندگی میں کچھ ایسے لوگ آتے ہیں جن کی ذات ہمیں اونچائیوں کی طرف لے جاتے ہے نیئے پنکھ مل جاتے ہیں، نئی پرواز عطا ہو جاتی ہے۔۔محض ان لوگوں کی بدولت کئی دریچہ کھل جاتے ہیں۔اور وہ ہمیں اپنی شخصیت سے اس طرح متاثر کر دیتے ہیں کہ ہم چاہیں بھی تو انھیں تمام عمر فراموش نہیں کر سکتے ۔۔۔سو۔۔وہ ایسی ہی شخصیت تھے،ایک عظیم انسان،ایک بے مثال مصنف، باکمال اردو داں۔ اور وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرنے کے فن سے بھی واقف تھے۔۔وہ ایک عظیم فنکار تھے اور جب پہلی ملاقات ہوئی ان سے۔۔۔وہ نہ جانے قبولیت کی کون سی گھڑی تھی۔میری ہر تحریر کے لئے اللہ

کا انعام تھے وہ۔۔۔

میں ٹوٹے ہوئے وقت کے کانچ کو جوڑنے کا جتن کر رہی ہوں اور بیتے ہوئے شب و روز اپنی بھیگی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ وہ شام۔۔ نہ بھولی ہوں اور نہ بھولنا چاہتی ہوں جب ایک محفل ''شام افسانہ'' سجی ہوئی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی سال کے خاتمہ پر ہر ہوسٹل میں ''ہال ویک'' کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ یہ روایت اب بھی قائم ہے لیکن اب تو ہر روایت کا چہرہ۔ بدل گیا ہے۔ بہرحال یہ بات تو ہر جگہ، ہر تعلیمی ادارے کے لیئے کہی جاسکتی ہے۔ گو کہ یہ عمل اچانک نہیں ہوا اس عمل کے ظہور پزیر ہونے میں کئی برسوں کا عرصہ لگا ہے لیکن یہ تو ابھی کی بات لگتی ہے کہ جب مشاعروں میں کمنٹس بھی دیئے جاتے تو تہذیب کے دائرے میں دھ کر، شاعروں کو ان کمینٹس کا انتظار ہوتا تھا۔ طلباء ہوٹنگ بھی کرتے تو وہ بھی لطیف انداز میں مناسب اور پر مزاح انداز میں بھی ہیں مگر کرتے تو، جو انداز گفتگو بدلا ہے، اس کا کوئی تدارک نہیں صرف ہمارے آپ کے دل دکھتے ہیں آنکھیں نم ہوتی ہیں۔۔۔

اس ہال ویکس کے پروگرام میں وہ باکمال شخصیت موجود تھی۔ کچھ لڑکیوں اور لڑکوں نے آگے بڑھ کر ان سے آٹو گراف کی فرمائش کی۔ وہ سر جھکائے ہاتھ بڑھا کر مسکرا کر۔۔ آٹو گراف بک لیتے اپنا دستخط کرتے اور واپس کر دیتے۔ جب میں نے اپنی نوٹ بک بڑھائی تو کہا۔'' آپ اسپر اپنی ناول کا کوئی جملہ لکھ دیجیئے'' انھوں نے ایک دم سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور مسکرا کر بولے

۔'' آپ نے میری کون سی کتاب پڑھی ہے۔۔؟''

''میں نے آپکی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔۔'' میرا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔

''چلیئے پھر آپکا امتحان لے لیتے ہیں۔۔۔۔'' انھوں نے میرے ہاتھ سے نوٹ بک لی اور اس میں

ایک جملہ لکھ دیا۔مسکرا کر بولے

۔''بتایئے یہ کس ناول میں ہے؟؟''اور میں نے تو جیسے ان کی ساری کتابیں حفظ کر رکھّی تھیں ۔فوراً بتا دیا۔ پھر تو وہ ایک گیم کی طرح اپنی ناولوں کے جملے پوچھتے گئے اور میں نام بتاتی گئی۔ وہ کچھ حیرت اور مسرّت سے مجھے دیکھتے رہے۔۔۔ان کی وہ نظر آج بھی مجھے یاد ہے۔کسی قدر ہنس مکھ انسان تھے سیکڑوں لطائف از بر تھے انھیں ۔ جب بھی محفل سجتی ان کے ساتھ ادبی گفتگو ہوتی اور قہقہوں کا دریا بہتا رہتا۔ دعوتیں کرنے کا بھی خاص شوق تھا ان کو شام کو اکثر نشست جمتی ۔ہم لڑکیوں کو تو ہوسٹل سے اجازت نہ ملتی مگر کلاس کے لڑکے جو ان کے پسندیدہ اسٹوڈنٹ تھے وہ ضرور مدعو ہوتے ۔ دوسرے دن کلاس میں یہی باتیں ہوتیں کہ آج فلاں افسانہ سنا آج چائے اور پیسٹری کی دعوت اڑائی ۔۔آج یہ آج وہ۔۔۔کبھی پائے کبھی بریانی۔۔ان سے نہ مل سکنے کی بڑی کوفت ہوتی مگر جب ان کا نیا افسانہ ہاتھ میں آجاتا تو ساری کوفت دور ہو جاتی ۔ایک ایک کر کے سارے افسانے اور ناول جمع ہو گئے

۔تعلیمی مدارج ختم ہوئے۔۔اور پھر زندگی کے تقاضے۔۔دنیا کافی بدل گئی۔سنا انھوں نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لی کافی ہنگامہ رہا افسوس بھی ہوا۔مگر جو عزّت دلوں میں تھی وہ برقرار رہی ۔ابھی کچھ دنوں پہلے یہ طے ہوا کہ ان کا انٹرویو ٹی۔وی۔ پر آنا چاہیئے ۔انھیں اردو اکاڈمی کی طرف سے بلند پایہ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔۔۔ماس کمیونی کیشن اور جرنلزم میں ایم۔اے کرنے کے بعد میں نے کئی شاعروں اور ادیبوں سے انٹرویو لئے تھے۔۔۔مگر آج دل کسی اور ہی انداز میں دھڑک رہا تھا۔۔۔

ہم اپنی ٹیم لے کر ان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ کافی دیر ڈور بیل بجانے کے باوجود کوئی دروازے پر نہیں آیا۔ ہم مایوس ہو گئے تھے تبھی ایک خاتون نے دروازہ کھول دیا۔ وہ

کافی جھنجھلائی ہوئی تھیں۔دروازہ کھل گیا تھا مگر ہم باہر کھڑے حیرت سے ان صاحبہ کو رہے تھے جو مشکل سے 22یا23 برس کی خاتون تھیں اور چہرے پر کرختگی نمایاں تھی

۔''کیا بات ہے۔۔۔؟ کیوں پریشان کرتے ہیں بے وقت۔۔جب دیکھو گھنٹی بج رہی ہے۔۔ کوئی نہ کوئی شاعر ادیب دروازے پر موجود۔۔آپ لوگوں کو اپنے گھر پہ قرار نہیں ہے۔۔۔؟''

''محترمہ۔۔۔محترمہ۔۔''میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ سننے پر تیّار کہاں تھیں

۔''کس کی سنوں۔۔کس کس کی سنوں۔۔کیا ہے؟ انھوں نے اندر چہرہ گھما کر ڈانٹ کر کسی سے کچھ کہا۔پٹختی غصّے میں دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلی گئیں۔۔۔ہم شرمندہ سے کھڑے رہے۔۔وہ پھر پلٹیں۔

۔''اب کیا سواری بھیجوں آپ لوگوں کو اندر آنے کے لیئے؟؟؟؟ ہم پانچ لوگ تھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ایک داخلی دروازہ اور اس کے برابر ایک چھوٹا کمرہ۔۔۔ ایک کونے میں لکڑی کی میز اور کرسی ،میز پر کتابوں اور کاغذوں کا انبار۔۔ایک دیوار میں کھلی الماری، جہاں دھول میں اٹی بے شمار ان ہی کی تخلیقات۔۔ایک کنارے کی دیوار سے لگا ہوا پتلا سا پلنگ۔۔۔اس پر نحیف ونزا سا وجود۔۔۔ان پر پڑی ہوئی میلی سی رضائی اپنا حال خود بیان کر رہی تھی۔۔۔ہلکی ہلکی سانسوں کی ڈوبتی ابھرتی آواز۔۔۔میں بیقرار ہوکر آگے بڑھی۔۔۔ہاں ۔۔۔بستر پر وہی تھے۔بے حد نحیف۔۔کمزور ان کی خوبصورت انگلیاں کپکپا کر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔۔۔پاس پڑی میلی میلی کرسیوں پر ہم ان کی خاطر بیٹھ گئے۔باقی لوگ میز سے ٹک کر کھڑے رہے۔۔۔کیمرہ مین نے کیمرہ فٹ کیا۔

مجھے ان سے سوالات کرنے تھے مگر آنسوؤں سے آواز رندھ رہی تھی، ہاتھ اٹھا کر کیمرے کو چند لمحے رکنے کو کہا اور اٹھ کر سرہانے گئی۔۔۔بڑی بڑی ذہین آنکھیں حلقوں میں ڈوب رہی تھیں۔۔سرخ

رہنے والے ہونٹ سفید تھے اوران پر بھوری پیڑیاں جم رہی تھیں دونوں ہاتھوں کی سفید انگلیاں اضطراری حالت میں کپکپارہی تھیں۔

انھوں نے کچھ کہا تھا میں نے جھک کر سننے کی کوشش کی مگر وہ شاید ملازمہ سے کہہ رہے تھے جو دروازے پر استادہ تھی۔ میں نے اسے اندر بلا لیا اس نے ان کی بات سنی اور ''اُونہہ۔۔۔'' کہکر اندر چلی گئی۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں

۔''اب یہ جو پیسے ملے ہیں انھیں جب تک اڑا نہیں لینگے چین تھوڑا ہی آئیگا۔۔۔اسی طرح کے آنے جانے والوں پر خرچ کردینگے۔۔۔'' آواز دھیرے دھیرے دور ہوتی جارہی تھی۔ غالباً یہ ان کی بیگم کی آواز تھی۔ یہ آوازیں ہماری سماعتوں میں زہر پھیلا رہی تھیں۔ ان کی معصوم آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے وہ کتنے بے بس اور مجبور نظر آرہے تھے اتنی عمدہ زندگی گزارنے والے شخص کی یہ حالت۔۔۔ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے

۔''ہم ابھی ابھی چائے پی کر آئے ہیں''میں جھک کر ان سے یہ کہا۔۔تو میرے آنسو ان کی پیشانی بھگو گئے، شاید وہ اُٹھنا چاہتے تھے اپنے مہمانوں کی خاطر کرنا چاہتے تھے چائے پلانا چاہتے تھے۔ ان کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ معذوری اور مجبوری کا احساس ان کی آنکھوں میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ غم کا ایک اتھاسمندر تھا جو ان کے وجود میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا کہنا اور کیا سنانا چاہتے تھے۔ ہم ان کی خاموش آواز سن رہے تھے، سمجھ رہے تھے۔ لیکن جواب دینے سے قاصر تھے۔

اٹھارہ کیرٹ گولڈ

لندن کے کہر بھرے موسم سے بور ہو کر ہم ہر دوسرے سال ہندوستان ضرور آتے، جبکہ بچوں کو اور فہیم کو پیرس یا جرمنی جانے کی زیادہ خوشی ہوتی تھی مگر میرے پورے دو سال اسی انتظار میں کٹتے تھے۔ ملنا تو سب ہی عزیزوں سے ہوتا تھا، سسرال میں بھی وقت گزارتا ہوتا تھا مگر ٹھہرتی میں ہمیشہ ذکیہ ہی کے پاس تھی...... میری اپنی پیاری ذکیہ میری دوست...... سب سے اچھی ساتھی...... لمبے سیاہ بالوں میں گھرا اس کا سانولا سلونا چہرہ، اس کی خوبصورت آنکھیں۔۔ بوٹا سا قد ۔۔۔ ہمیشہ ایک مہربان سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری رہتی۔۔ ایک عجیب سی کشش تھی اس میں جو بھی اس سے ملتا گرویدہ ہو جاتا۔ جب بھی میں اس کے گلے لگتی ڈھیروں سکون میرے دل میں

اتر جاتا۔

۔اور پیاری سی دمکتی ہنستی لڑکی کو میں نے اپنی بھابی بنالیا تھا۔اس بار بھی جب ہم اس کے گھر پہونچے وہ دروازے پر بیقراری سے مجھ سے لپٹ گئی اور دیر تک یونہی لپٹی کھڑی رہی۔سب سے مل کر جب رات کو میں سونے کے لیےاس کے پاس لیٹی تو مل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

۔''ذکیہ...... جب ہم ہندوستان آتی ہوں تو وقت اتنا کم کیسے ہو جاتا ہے دن اتنی جلدی جلدی کیوں گزرنے لگتے ہیں؟؟؟؟ میں نے اس کی طرف کروٹ لے کر اس کا چہرہ دیکھا اور اس چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں دیکھ کر بیقرار ہوگئی

۔کیا ہوا ذکیہ؟؟؟؟

''کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں ۔بس ایسے ہی ۔۔ ہاں تم صحیح کہتی ہو......''اس نے میرے ماتھے سے بال ہٹائے اور میرے پیشانی چوم لی۔

''کوئی پریشانی ہے ذکیہ؟؟'' مجھے الجھن سی تھی۔

''نہیں کوئی بات نہیں ۔ بہت تھک گئے ہیں چلو اب سو جاتے ہیں ۔کل شاپنگ پر لے چلونگی۔اور پھر تم کو اپنی سسرال بھی تو جانا ہے نا۔دیکھو وہاں زیادہ مت ٹھہرنا۔بس دو دن کافی ہیں......''

اس نے اٹھ کر لائٹ بجھائی اور ہم نے جانے کب سو گئے ۔فہیم او بچے تو دوسرے ہی دن گھر چلے گئے مگر میں دو چار روز بعد آنے کا کہہ کر رک گئی۔اپنی ساری شاپنگ میں ذکیہ کے ساتھ ہی کرتی تھی۔الہ آباد میں میرے سسر کا پشتینی مکان تھا اس گھر میں جاتے ہوئے فہیم اور بچوں کی خوشی دیکھنے والی ہوتی، آس پاس کے سبھی رشتہ دار ہم سے مل نے وہیں پہونچتے تھے۔اپنے پیاروں سے ملنا بھی ایک نشے کی طرح ہوتا ہے اور مجھے تو اتنی دور رہ کر کچھ زیادہ ہی تڑپ پیدا ہو جاتی تھی۔ میں ان تھوڑے سے دنوں کی چادر کو مضبوطی سے تھامے رہتی اور اپنے بہن بھائیوں اور

عزیزوں سے کی ہوئی ہر چھوٹی بڑی بات ہر ہنسی ہر آنسو سب کچھ اس چادر میں جمع کر لیتی اور جب اس تہہ کر کے رکھتی تب بھی کئی مسکراتے چہرے اس میں سے جھانکتے رہتے۔ کیا ہر کسی کو اپنوں سے مل کر اتنی ہی خوشی ہوتی ہوگی؟ میں نے اپنی شاپنگ لسٹ ذکیہ کو تھمادی کیونکہ بازار تو اسی کا تھا میں تو یہاں پردیسی تھی نا؟ ایک لمبا عرصہ دیار۔غیر میں رہتے ہوئے ہو گیا تھا بیٹا ۱۹ برس کا ہونے والا تھا اور ذکیہ کی بیٹی عنب بھی بڑی ہو رہی تھی میرا پورا ارادہ تھا کہ میں اسے مانگ لونگی ذکیہ مجھے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گی۔

میں نے اپنے بیٹے ارزیب کی اور عنب تو ذکیہ کی کاربن کاپی ہے بس رنگ بھیّا کی طرح بے حد گورا ہے۔ میں ہر سال کچھ نہ کچھ سبھی کے لیے لے آتی تھی مگر عنب تو میری بیٹی تھی اس لیے اس کے لیے بہت سوچ کر اسبار ایک ہلکا سا سونے کا سیٹ لیتی آئی تھی۔ جس میں انگوٹھی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ٹاپس اور ایک لاکٹ تھا۔ اس نے جب یہ سیٹ پہن کر مجھے دیکھایا تو واقعی اس پر بہت سج رہا تھا حالانکہ ذکیہ کے پاس امّاں کا دیا ہوا بہت زیور موجود تھا جو اس شادی پر اس کے بعد بھی ہر موقع پر ملتا رہا۔ اس کے میکے سے بھی کئی سیٹ زیور کے ملے تھے۔ مگر پھر بھی عنب اس ننھے سے تحفے کو پا کر بہت خوش تھی۔

امّاں نے جب ذکیہ کو میری پسند والا زیور پہنایا تھا تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی تھی شادی کے جگمگاتے زیور اور کپڑے پہن کر جب ذکیہ اس گھر میں اتری تو گویا جنّت اتر آئی۔ مگر ہماری خوشیوں کی عمر زیادہ نہیں تھی، اچانک ایک ایکسیڈنٹ ہوا۔ اور ہمارا گھر اجڑ گیا۔ بھّیا ہمیں چھوڑ گئے۔ بھیّا نے مجھے کبھی ابّا کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی جو میری پیدائش سے پہلے ہی اس دنیا سے جا چکے تھے میں بھّیا کو ہی ابّا سمجھتی تھی۔ بھیّا نے فہیم سے میری شادی بھی اس لئے کی کہ ہم کالج سے ہی ایک دو سرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ فہیم کا بزنس اب کافی پھیل گیا تھا وہ لندن اور دوسرے کئی ملکوں سے

کپڑوں کا کاروبار سنبھال رہے تھے الہ آباد میں بھی کئی فیکٹریز تھیں۔ جو ان کے بھائی دیکھتے تھے عنب کی پیدائش کی دوسرے برس ہی بھیّا چلے گئے۔

وہ گئے تو ایسا لگا جیسے کسی نے ہمارے سروں سے چادر کھینچ لی۔ میں فوراً ذکیہ کے پاس ہندوستان آ گئی تھی مگر ذکیہ تھی کہاں؟؟؟؟ وہ تو بھیّا کے ساتھ ہی جیسے کہیں غائب ہو گئی تھی سپاٹ چہرہ سفید ہونٹ۔ بکھرے بال میلے کچیلے کپڑے ہنسنا تو دور کی بات وہ تو رونا بھی بھول گئی تھی۔ میں ہی اس سے لپٹ کر اتنا روئی کہ وہ ہوش میں آ گئیں۔ اور پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ کئی گھنٹوں تک چیخ چیخ کر روتی رہی اور پھر میری باہوں میں بے ہوش ہو کر گر گئی۔ ان سات برسوں میں اس نے اپنے آپ کو بہت سنبھال لیا تھا اور اپنی زندگی کا مرکز عنب کو بنا کر جینے کو کوشش میں جٹ گئی تھی۔ ان دونوں کے علاوہ گھر میں ہماری پرانی ملازمہ کمّو بوا بھی رہتی تھی۔ نام تو ان کریمن تھا مگر پتہ نہیں کیسے وہ کمّو بوا کے نام سے ہی جانے جاتیں۔ وہ بھابی ذکیہ کو اس لیے چاہتی تھیں کہ بھیّا ان کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ انھیں عشق تھا کمّو بوا سے۔ اپنی ہر بات ہر ضد وہ انہیں کے ذریعے امّی تک پہنچاتے تھے۔ میرے آ جانے سے ان کے جھریوں بھرے چہرے پر تازگی آ جاتی۔ وہ مجھے ایک ماں کی طرح عزیز تھیں۔ آج بھی صبح صبح جب انھوں نے آ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹائے اور چائے سائیڈ ٹیبل پر رکھی پھر میرے چہرے پر دعائیں پھونکیں۔ تو میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کمّو بوا......'' میں نے چائے کا گھونٹ لے کر ان کی طرف دیکھا۔ ''ہاں بیٹا......''

انھوں نے تھکا ہوا سانس لے کر میرا لحاف برابر کیا

۔''ایسی چائے کہیں نہیں ملتی کمّو بوا......اب کی بہت ساری چائے بنا کر میرے ساتھ کر دینا......''

میں نے پیالی خالی کر کے رکھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ جلدی جلدی منہ دھو کر کنگھا کر کے واپس آئی تو بوا کپ ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیٹھی تھی۔ کچھ عجیب سی کیفیت ان کے چہرے پر ہویدا تھی۔

''کیا ہوا......''میں نے تولیہ پھینک ک ان کو تھام لیا

۔''بیٹا......''وہ بڑی دقت سے گویا ہوئیں

کب تک رہو گی.........؟''

میں ہنس پڑی۔''ارے۔اس بات کے لیے پریشان ہو؟؟''ابھی تو الہ آباد بھی جانا ہے آ کر کچھ دن واپس رکونگی۔۔۔ابھی تو شاپنگ بھی پوری نہیں ہوئی......بوا......سب ٹھیک تو ہے نا؟ وہ کارپٹ پر سر جھکائے بیٹھی تھیں۔اور اس پر بنے ہوئے پھولوں پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں اور الفاظ ساتھ نہ دے رہے ہوں

۔''کمّو بوا؟؟ میں نے نیچے بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام لیے۔

''بولیں کیا بات ہے میرا دل گھبرا رہا ہے۔۔ بتایئے بوا......''''بیٹا جب سے تم گھر میں آئی ہو رونق ہو گئی ہے۔جیسے بھیّا لوٹ آئے ہوں۔جیسے سب کچھ وہی...... جو میاں اور بیگم صاحب کے زمانے میں تھا۔مگر بیٹا۔''وہ پھر سے چپ ہو گئیں۔ان کی بوڑھی آواز تھرتھرا رہی تھی

۔''کمّو بوا......مرا دم نکل جائے گا۔بتایئے کیا ہوا ہے۔؟''

"پارسال جب تم آئیں تھیں۔تب سے اب تک دلہن اپنا کافی زیور بیچ چکی ہیں۔جو بھیّا یہ گھر نہ بنوا جاتے تو چھت کا سہارا بھی نہ ہوتا۔گھر کا سب قیمتی سامان جو عنب بیٹا کے لیئے رکھا تھا۔ایک ایک کر کے ان سات برسوں میں بک چکا ہے۔بس بیٹا۔یہ ڈرائنگ روم کا سامان بچا ہے۔جو تمہارے ڈر سے نہیں نکالا کہ آ کر پوچھو گی۔تو کیا جواب دینگے۔اور دلہن بچاری بھی کیا کرے؟ اب گاؤں میں کوئی دیکھنے سننے والا نہیں۔غلّہ بھی بہت کم آتا ہے۔کوئی آمدنی کہیں سے نہیں رہی۔"انہوں نے رک کر گہری سانس لی۔میرے اندر دھڑ دھڑ کر کے لندن کو بلند و بالا عمارتیں گرنے لگیں۔میرے چہرے پر میری ہی فرمائیشوں کے تھپّڑ پڑنے لگے۔میں نے کبھی یہ نہیں سوچا میری پیاری بھابی کیسے گزر کر رہی ہے۔بھیّا کے بعد کون سا سہارا ہے اس کے پاس؟ مجھے ہمیشہ یہی لگا کہ جیسی

رانیوں والی زندگی وہ جی رہی تھی۔ وہی اب بھی۔ مگر میں...... جو اس سے محبت کا دعوہ کرتی ہوں میں نے کبھی روک کر اسے پوچھا تک نہیں۔؟ یہ کیسی بے حسی اوڑھ لی تھی میں نے۔ صرف فرمائشیں کرتی رہی۔ کبھی رک کر اس کے آنسو نہیں دیکھے اس کی روح میں نہیں جھانکا۔؟ میرا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ تب بوا نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولیں

۔" بیٹا۔ جو سیٹ تم عنب بیٹا کے لیے لائی ہو۔ اس میں سونا بہت کم ہے۔ دلہن نے مجھے سنار کے پاس بھیجا تھا۔ اس نے کہا وہ اٹھارہ کیرٹ کا ہے۔ بہت کم قیمت دے رہا تھا تو میں واپس لے آئی ہوں۔ اب تو......"

بس وہ چپ ہو گئیں۔ میں نے دوڑ کر کھڑکی کا پٹ تھام لیا۔ باہر زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میرے گرم گرم انسوؤں نے مجھے اندر سے شرابور کر دیا تھا۔

☆☆☆

ہل من ناصراً

”پگلا گئے ہو کا تیواری۔۔۔ بھیا صاحب بے چارے سے کا مطلب؟ او کونو بات ما دخل نہیں دیت ہیں۔ ای سب چھوٹے بھیا صاحب کے ایماء پر ای سب جنے شیر ہوئی گئے ہیں“ سکھ رام نے انگوچھا جھاڑ کر کاندھے پر ڈالا اور مونڈھا کھینچ کر تیواری کی کرسی کے پاس لاکر بیٹھ گئے۔”ارے بھائی ہیاں کبّو کونو فرق ناہی رکھا گوا ہے۔۔۔کونو جات برادری ما۔۔۔۔۔بھیا صاحب سب کے گھر جات ہیں سب سے ملت ہیں اور تو اور سبکا اپنے گھر بلاوت ہیں۔ای جھگڑا لپّا ان کا کام نا ہے ارے بھائی ہمارے بھیا صاحب تو دیوتا ہیں۔۔۔دیوتا“

”مگر یار بتاؤ یہ سب ہوا کیسے۔۔۔۔؟ ہر سال تعزیے اٹھتے ہیں ہر سال محرّم منایا جاتا ہے پورا گاؤں مل جل کر سب کام کرتا ہے پھر آخر۔۔؟

''اب تم کا بتائی۔۔بھیّا صاحب کے ابّا جون رہے ان کے جمانے سے سب کے تعزیہ ان کے امام باڑے مار کھتّے جات رہے۔۔نومحرم کا سب جنے اپنا اپنا چوک بنائے کے تعزیہ لیجات رہیں مگر دس محرم کا سب جنے ایک ساتھ اٹھاوت رہے۔۔سب سے آگے بڑے بھیا صاحب کا تعزیہ، اور او کے پیچھے چھوٹے بھیا صاحب اور پھر گاؤں والن کے۔۔۔کبھی کونو بات نہ بھئی تا جیہ چاہے چھوٹا ہوئے چاہے بڑا۔۔ ہے تو امام صاحب کا؟؟ مگر اب جمانہ تون بدل گوا ہے گاؤں کے پاسی چمار ۔۔نائی دھوبی سب منھ کت آوے لگے ہیں۔''

''یار میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ ان کے آپس کا کیا معاملہ ہے۔۔'' تیواری نے بات کاٹ کر پوچھا ۔۔۔اس بار وہ تھوڑی دیر کے لیئے چپ ہو گیا۔۔وہ جانتا تھا کہ یہ سب اندر کی باتیں ہیں۔اگر کسی کو ذرا بھی بھنک لگ گئی کہ ''دونوں کوٹ'' کی بات اس نے بتائی ہے تو اس کے لئے بھیّا صاحب کے سامنے سر اٹھانا مشکل ہو جائے گا۔مگر بغیر بتائے اس کا حل کیسے نکلے۔۔ یہ سوچ کر وہ کھنکھار اور تھوڑا بہت بتانے کا فیصلہ لے ہی لیا

''دیکھو بھائی۔۔۔! ہمکا جیادہ تو معلوم نہیں بڑے بھیّا صاحب اپنے چھوٹے بھائی سے پہلن سے الگ رہت رہیں۔۔مکدمہ چلت رہا جایئداد کا۔۔۔سامنے کچھ بات ناہی لاوت رہیں وجہ دار آدمی رہیں۔اب او تو گئے مر۔۔۔ای لڑکے لوگ ہیں کھون گرم ہے۔۔۔بات بے بات لڑائی جھگڑا۔۔تیوراری ای سب چھوڑو جاؤ بھیا صاحب سے پوچھو او سب قصہ بتائے رہیں۔۔ بہت عمدہ آدمی ہیں''

تیواری نیا نیا تھانے میں تعینات ہو کر آیا تھا۔اتفاق سے سکھ رام اس کا ماموں ذاد بھائی بھی اسی گاؤں میں رہتا تھا۔تیواری گاؤں اور یہاں کی سیاست سے ناواقف تھا۔اس کو سکھ رام سے کافی مدد ملی۔۔اور محرم میں اچانک گڑبڑ کا احساس ہوتے ہی اس نے سارے عملے کو چوکس کیا۔۔۔اور

جلوس میں پہونچ گیا۔۔۔اس وقت تو بات بن گئی۔۔مگرا نگاروں پررا کھ پڑ جائے تب بھی وہ اندر ہی اندر دھکتے رہتے ہیں، زرا سی ہوا چلتی اور نا جانے کتنے گھر خاکستر ہو جاتے۔اسی لیئے تیواری گاؤں کے پرانے لوگوں سے ملتا رہااور سارے معاملات سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔درگا پرشاد گاؤں مکھیا ہونے کے ساتھ ساتھ اکھاڑے کا ماسٹر بھی تھا۔۔۔اس کی دھاک جمی ہوئی تھی۔بھیّا صاحب سے بھی بہت دوستی تھی مگر بات ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ جذباتی ہو گیا۔ہوا یہ کہ جب پانچ مُحرّم کو علم کا پھریرا کھیت کے کنارے لگے ہوئے ببول کی شاخ میں الجھا تو کئی جگہ سے مسک گیا۔۔۔اور بھیّا صاحب نے اسی وقت ببول کٹوا دیا۔وہ پیڑ کافی پھیل چکا تھا اور ابھی کئی جلوس نکلنا باقی تھے۔۔وہ کھیت درگا پرشاد کا تھا اور اس نے حفاظت کے لیئے ببول لگا رکھے تھے۔لیکن اگر اس جگہ وہ ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا جو بھیّا صاحب نے کیا۔مگر وہ تو تھا نہیں۔۔۔اور چھوٹے بابو صاحب نے جس طرح یہ واقعہ بیان کیا، وہ بھڑ گیا۔

''بھیا صاحب کی نظر میں ہندوں کی کوئی وقعت تو ہے نہیں۔۔۔آج تمہارا ببول کٹوایا ہے کل باغ کو آگ لگوا دینگے۔۔ہم تو جانتے ہیں نا انکو۔۔۔۔ارے درگا۔۔۔کیوں بزدلی رکھا رہے ہو۔۔؟ مٹھی بھر مسلمان ہیں اس گاؤں میں۔اس علاقے میں تم ہی سب سے زیادہ طاقت ور ہو۔ پوج لو ۔۔۔دکھادو اپنی طاقت۔۔۔تاکہ آیئندہ ایسا ویسا کچھ نہ ہو سکے۔۔''

''مگر چھوٹے بابو صاحب۔۔'' وہ ہچکچایا ''دیکھو بھئی ہم تو تمہاری طرف ہی ہیں اب تم اپنے آدمیوں سے بات کرو۔۔ جو مناسب سمجھو وہ کرو۔۔ہمیں کوئی ضرورت نہیں تمہاے معاملات میں دخل دینے کی۔۔۔تم خود سمجھدار ہو بھئی۔۔اتنا بڑا تعزیہ رکھتے ہو۔۔پھر بھی پیچھے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔ باجے پر پیسہ خرچ کرتے ہو اتنے سارے لوگوں کو کھانا بھی کھلواتے ہو۔۔۔پھر بھی ان کے برابر نہیں۔۔جب چاہیں تمہارے پیڑ کٹوا دیں۔۔تمہارے کھیت اجڑوا دیں یا تمہارا باغ پھنکوا

دیں۔۔'' وہ آگ لگا کر اٹھے اور زمان خانے میں چلے گئے۔۔

۔درگا پرشاد تھوڑی دیر بیٹھا ان کی ساری باتوں پر غور کرتا رہا۔۔اس کے اندر شعلے بھڑ کنے لگے۔۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس کی ماں نے شادی کے سات برس بچّے کی آس میں کاٹ دیے تھے اور پھر نو محرّم کو امام بارگاہ کے سامنے رو رو کر اسے مانگا تھا۔اور جب وہ گود میں آیا تو سب سے پہلے وہاں لے کر آئی تھیں۔وہ دونوں میاں بیوی ساری رات امام بارگاہ کے صحن میں بیٹھے شکر ادا کرتے رہے تھے۔وہ سب کچھ بھول گیا۔۔کتنی بار بھیّا صاحب اس کو اپنے گلے لگایا تھا انکے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا چکا تھا۔وہ یہ بھی بھول گیا اس کے پتا جی محرم کے تعزیے کس اہتمام سے اٹھوایا کرتے تھے۔عشرے کے دن سہ پہر تک وہ بھی ان کے ساتھ بھوکا پیاسا رہتا تھا۔۔۔وہ سب بھول گیا۔نفرت غالب آ گئی، سیاست اپنا کام کر گئی۔چھوٹے بابو اپنے ہرکاروں کو سارا کام سمجھا کر نو محرم ہی کو فیض آباد نکل گئے۔

وہ صبح بہت اداس تھی، درگا پرشاد اپنے آدمیوں سے کئی بار میٹنگ کر چکا تھا۔۔۔ہتھیار لباسوں۔اور تازیہ کے نیچے لگی ہوئی چادر میں چھپائے گئے تھے۔۔وقتِ ضرورت نکالے جا سکتے تھے۔۔اک سرد سی خاموشی ہر طرف سنائی دے رہی تھی۔

گیارہ بجتے بجتے بھیّا صاحب نے جلوس اٹھوا دیا۔سب سے پہلے علم امام بارگاہ سے باہر آیا۔۔پھر اور سارے تبرّکات ایک کے بعد ایک اٹھائے گئے اور پھر تعزیہ نمر دار ہوا۔۔۔جلوس کربلا کی سمت روانہ ہوا۔۔

۔'' آج شبّیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے'' میر انیس کے مخصوص مرثیہ کی آواز نے فضا کو اور سوگوار کیا۔۔

دوسری طرف درگا پرشاد کے سارے آدمی تیّار تھے، آج اس کے دل میں عقیدت کا کوئی جذبہ نہ

تھا۔۔اگر تھا تو صرف نفرت اور انتقام کا جذبہ۔۔

۔اچانک دروازے کے باہر کوئی بھاگتا ہوا آتا دکھائی دیا۔۔۔سامنے کچّی زمین پر دھول اڑ رہی تھی۔۔۔دھول چھٹی تو درگا پرشاد کی نظر اس بچّے پر پڑی جس کا چہرہ جذبات کی شدّت سے سرخ ہو رہا تھا۔۔۔وہ راحیل تھا، بھیا صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا۔

''درگا چچا۔۔۔انسے پھولتی سانسوں کو سمیٹا۔۔اور پھر بولا۔۔''درگا چچا۔۔امی جان بتا رہی تھیں کہ آپ لڑائی کرنے جا رہے ہیں؟۔۔۔آپ سب کو مار دینگے۔۔۔''اس نے کرتے کی آستین سے انکھیں صاف کیں'

'آپکو پتہ ہے؟ جب کربلا کے میدان میں امام حسین (علیہ السلام) اکیلے رہ گئے تھے۔۔تو ایک چھوٹا سا بچّہ ان کی مدد کرنے آیا تھا۔۔۔اور جب اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے تو دشمنوں نے اس کی کلائیاں کاٹ دی تھیں۔۔۔مگر لڑائی بند نہیں ہوئی تھی۔۔مگر آج آپ لڑائی بند کر دیجئے۔

''اس نے اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھ آگے بڑھائے۔۔۔اور بولا

۔۔'' لیجئے آپ بھی میری کلایئاں کاٹ دیجے۔۔مگر لڑائی بند کر دیجے۔۔ چاچی جی بھی امّی کے ساتھ فریادی ماتم کر رہی ہیں امام باڑے میں۔۔۔'' وہ بولتے بولتے تھک کر چپ ہوا اور منّت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔۔درگا پرشاد اس بچے کی لمبی بلکوں پر جمی دھول دیکھ رہا تھا، اچانک ایک درد کی لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا۔۔۔اس کے اندر ایک نہر سی بہنے لگی۔۔۔وہ نہر بہت شفّاف اور بہت خنک تھی جس میں اس نے اپنا اور بھیّا صاحب کا بچپن دیکھا۔۔اپنے ماتھے پر لگی چوٹ اور امّی جان کے ہاتھوں سے لگا یا مرہم دیکھا۔۔۔ان کی گود میں بیٹھکر اپنے آپ کو نوالہ کھانا کھاتے دیکھا۔۔۔اسکول کے زمانے میں اپنے لیئے بھیّا صاحب کو لڑائی کرتے دیکھا۔۔اس کے اندر کی آگ سرد ہوتی گئی۔۔۔اس کے اندر ایک نرم سی کونپل

پھوٹنے لگی۔۔۔ باہر سے اندر کی طرف آتے ہوئے تیواری نے بچّے کو گود میں لینا چاہا۔۔ جب تک درگا پرشاد نے بڑھ کر پہلے اس کے کالے کرتے کی آستینیں برابر کیں اور پھر اسے گود میں لے کر زور سے بولا۔۔

۔''چلو۔۔۔ آٹھاؤ جلوس۔۔۔ پیچھے رہنا خبردار کوئی آگے نہ نکلے۔۔'' اپنا جذبات سے دہکتا چہرا اور آنسو راحیل کے بالوں میں چھپا کر وہ خود بھی آگے بڑھ آیا۔۔

۔باجے والے آگے پھر ماتم کرتی انجمن اس کے پیچھے گاؤں کے سارے تعزیے۔۔۔ اور آخیر میں درگا پرشاد آہستہ آہستہ گاؤں سے نکالا اور کربلا کی جانب چل پڑا نہر پر ہمیشہ کی طرح سب ایک ساتھ چلتے ہوئے پہونچے۔۔ جلوس خیریت سے کربلا پہونچا۔۔تعزیے دفن ہوئے۔۔ مٹی ہوگئی شام ہونے لگی تھی ایک وحشت ناک سنّاٹے نے سبکو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا، دھول کے بگولے ادھر ادھر گھوم رہے تھے، نہر کا پانی اداسی سے بہہ رہا تھا۔۔۔ لوگ ٹکڑیوں میں واپس جا رہے تھے۔۔ بھیّا صاحب نے جاتے جاتے مڑکر دیکھا۔۔ درگا پرشاد سر جھکائے ہوئے منڈیر پر بیٹھا تھا۔۔۔ بھیا صاحب واپس پلٹے اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی نرم آواز میں بولے

''چلو درگا۔۔امّاں فاقہ شکنی کے لیئے انتظار کرتی ہونگی۔''

☆☆☆

ریت کا ماضی

ہمیشہ کسی طرح آج پھر اماں اپنی رام راج کی باتوں میں مشغول تھیں اور آج بھی ہمیشہ کی طرح دل برداشتہ نظر آ رہی تھیں۔ کئی بار انھوں نے یادوں کی بوچھار میں بھیگ کر اپنی حویلی کے بلند دالانوں اور طویل کمرون کی باتیں دہرایں کئی بار جب اپنی ذاتی ملازمہ کو یاد کیا جس نے انھیں اپنی ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا اور اماں جب بولنے پر آتیں تو بولے ہی جاتیں وہ ہندوستان میں تھیں تو انھوں نے کیا کیا آرام کیے کتنی بیفکر زندگی گزاری اور پھر یہ پاکستان کا محض چار کمروں کا گھر جہاں سانس لینے میں بھی دم گھٹتا تھا انکا۔ اختر میاں سر جھائے ان کی باتیں سنتے رہے انہیں کبھی کبھی ایسا لگتا کہ جیسے وہ خود ہندوستان کی اس عظیم الشان حویلی میں پہنچ گئے ہیں اپنے نانا کے پاس مسند و گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں، سامنے ملازم نے حُقّہ تازہ کر کے رکھ دیا ہے اور وہ قصبہ کے غریبوں کی کتھا سن رہے ہیں ان کا تصفیہ کروا رہے ہیں۔ اور پھر خواب ٹوٹ جاتا، وہ نانا کی شاندار حویلی سے واپس اپنے کراچی کے گنجان علاقے میں پہنچ جاتے جہاں ان کا چار کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔

امّاں کہتی تھیں اختر میاں کے ابّا بے چارے کو ہندوستان کی اتنی بڑی جا گیر کے عیوض بس یہ چھوٹا سا مکان ہی ملا اور وہ اللہ کا شکر کر کے بیٹھ گئے یہ نہیں کہ کوشش کرتے لوگوں نے کیسے کیسے مکانات ہتھیا لیئے کیسی کیسی حویلیاں الاٹ کروالیں مگر وہ بہت سیدھے سادے تھے نا؟ اختر میاں تو اس وقت صرف 2 برس کے تھے انھیں کیا معلوم کہ ان کے خاندان والوں نے کیا کیا عذاب سہے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں تب جا کے سر چھپانے کو یہ آسرا ملا مگر ان کو افسوس ضرور ہوتا کہ کاش ابّا بھی کوئی حویلی یا بنگلے کے لیئے کوشش کرتے امّاں کے دکھڑے تو ختم ہوتے۔

خیر اللہ کی مرضی وہ تو ہر طرح خوش رہنے والوں میں تھے، ان سے جو ہو پاتا وہ امّاں کی خدمت کرتے حتّی المقدور ان کی خواہشات پوری کرتے مگر امّاں ہر آنے جانے والے کے سامنے اپنی حویلی کا احوال اور اپنا اقتدار جتانا بھولتیں۔ اختر میاں اور ان کی معصوم سی بیوی ثریّا کو کبھی کبھی بہت کوفت کا سامنا کرنا پڑتا کہ اب امّاں بھول کیوں نہیں جاتیں جو بیت گیا سو بات گئی اب گزرے ہوئے وقت کے لیے اپنا اور بہو بیٹے کا دل کیوں جلاتی ہیں انھیں صبر کیوں نھیں اتا۔ یہاں بھی تو اپنا گھر ہے، چاہنے والا بیٹا، خیال رکھنے والی بہو ہے دونوں پوتے پوتی بھی ہر وقت اُن سے لپٹے رہتے پھر بھی۔ محلّے میں بہت عزت تھی سارے ہی لوگ دکھ سکھ کے ساتھی تھے پھر کیوں سب کو پرانی داستان سنا کر اداس ہوتی ہیں، ہمدردیاں سمیٹتی ہیں اور اختر میاں اور ثریّا کی دکھتی رگ کو چھیڑتی ہیں۔ مگر ان سے کون کہتا۔

اختر میاں تو امّاں کے دیوانے تھے، ثریّا بھی بس گھٹ کر رہ جاتیں۔ زندگی ایسے ہی گذر رہی تھی اچانک اختر میاں کو ہندوستان جانے کا موقع مل جاتا ہے ان کے کسی بہت عزیز دوست کے بیٹے کی شادی تھی وہ پیچھے پڑ گیا کہ چلنا ہی پڑے گا اور اختر میاں کی دلی مراد پوی ہوئی وہ اس دن بہت خوش گھر ائے اور امّاں سے لپٹ گئے۔

''امّاں میں ہندوستان جا رہا ہوں۔ اب میں اپنے پرانے گھر ضرور جاونگا سب سے ملونگا سب کتنے خوش ہونگے۔ امّاں میں بھی بہت خوش ہوں۔ آپ بھی خوش ہیں نا؟''

اور امّاں ہکا بکا سی ان کی شکل دیکھے گئیں پھر بڑی مشکل سے کھنکھار کے بولیں۔

''اے ہئے اب وہاں کیا دھرا ہے ادھے پاکستان آ گئے ادھے مرکھپ گئے اب وہاں کون ہے جس کے پاس جاوگے ہاں میری چھوٹی بہن، ارے تیری مہرو خالا، جو لکھنؤ میں رہتی ہے اس کے پاس جائیو اور کچھ سامان بھی دونگی وہ بھی مہرو کو پنہوچا دیجیو۔ دہلی میں شادی ہے تو بس جلدی واپس آئیو یہاں میری صحت خراب، ثریّا اکیلی۔'' وہ پلّو سے انکھیں پوچھنے لگیں۔

''ارے امّاں اب پہلی بار جا رہے ہیں تو کچھ گھومیں گے پھریں گے۔ آپ یہاں کی فکر مت کیجئے میں امین بھائی سے کہہ جاؤں گا وہ خیال رکھینگے۔''

اختر میاں سدھارے تو پہلی بار گھر میں تنہائیوں نے ڈیرا ڈالا دونوں بچّے صبح اسکول چلے جاتے ثریّا اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتی امّاں کو نا جانے کیا ہو گیا تھا وہ لیٹی رہتیں ثریّا کئی بار انھیں آوازیں دیتی باتیں کرنے کی کوشش کرتی مگر وہ خاموش لیٹی نا جانے کیا سوچا کرتیں۔ امّاں کی طبیت دیکھ کر ثریا پریشان ہوگئی وہ کھانا بھی برائے نام ہی کھاتیں ثریا سوچتی انھیں کچھ ہو گیا تو وہ اختر کو کیا جواب دیگی۔

دہلی پہنچ کر اختر میاں نے اپنی خیریت بتا دی تھی اور پھر وہ لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گئے۔ مہرو خالا سے ملکر انھیں بہت اچھا لگا وہ بہت دیر تک انھین گلے سے لگائے روتی رہیں ان کے آنسو بھی بالکل امّاں کی طرح تھے کئی دن اختر میاں وہاں رہے پھر انھوں نے اپنے وطن مرادآباد جانے کی ٹھان لی اور نکل پڑے۔ حدّ نگاہ تک سبزہ بکھرا تھا سرسوذں کے پیلے پیلے پھولوں سے کھیت سجے ہوئے تھے۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھے خواب دیکھتے رہے۔ ان کے پہنچنے پر گھر میں کیا ہنگامہ ہو جائے گا، سب کتنے

خوش ہو نگے ،اور نا جانے کیا کیا جس محلّے کا نام اماّں بتاتی تھیں وہاں پہو نچتے پہنچتے شام اتر آئی تھی وہاں پر بنے ہوئے تمام گھروں میں افلاس کی چادر تنی تھی۔مطلوبہ گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اوراس پر ایک میلا کچیلا سا پردا پھڑ پھڑا رہا تھا۔انھوں نے سراسیمہ ہوکر دروازہ بجایا تو ایک کرخت اواز سنائی دی۔

''کون ہے۔۔۔؟''

''میں ہوں اختر پاکستان سے آیا ہوں۔''

اندر کچھ کھٹ پٹ ہوئی پھر ایک کمزور سے وجود نے باہر جھانکا اس آدمی کے جسم پر ایک میلی بنیان اور پھٹی سی تہمد تھی اس نے انکھوں پر انگلیوں کا چھجا سا بنا کر باہر دیکھا اور ڈانٹ کر پوچھا۔۔

''کون اختر ؟؟؟''

''جی میں پاکستان سے آیا ہوں،عطیہ بیگم کا بیٹا''۔۔

تب وہ صاحب باہر آئے اورانھیں اندر آنے کی جگہ دی۔۔

''عطیہ کے بیٹے ہو؟''

تھوڑا جھجھک کر انھوں نے گلے لگا لیا کھپریل کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں دو بوسیدہ چار پائیوں کے سوا کچھ نہ تھا

''بیٹھو میاں۔۔۔''

وہ دھم سے چار پائی پر بیٹھ گئے

''کیسی ہے عطیہ؟؟''

''آپ۔۔میرا مطلب آپ امّی کے کون ہیں؟؟''اختر میاں نے ڈرتے پوچھا۔

''بتایا نہیں تمہاری امّاں نے؟؟ میں ان کا چچازاد بھائی، شاکر ہوں تمہارا ماموں۔۔کیسی ہے

عطیہ؟؟''

''جی ٹھیک ہیں بس۔۔آپ سب کو یاد کرتی ہیں۔۔''

''ارے یہاں یاد کرنے والی کیا بات ہے! اللہ کا شکر ہے عیش سے رہ رہی ہے، یہاں کیا تھا جو وہ یاد کرنے کو چھوڑ گئی۔۔''

ان کی آواز میں ٹوٹے کانچ کی چبھن تھی۔

''پھر بھی سب لوگ۔۔ابّا کی حویلی؟؟'' اختر میاں اٹک اٹک کر بولے۔

''حویلی؟؟؟'' کون سی حویلی۔۔کس کی حویلی؟۔۔میاں ہم پشتینی قلعئی گر ہیں، ہمارے سر پر جو چھت ہے وہ غنیمت ہے۔اب تو کوئی قلعی بھی نہیں کرواتا، ایسے ایسے برتن آ گئے ہیں بازار میں کہ قلعی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔عطیہ کے ابّا تو بہت غریبی میں مرے۔۔کوئی پوچھنے والا نہ تھا ہم ہی کبھی روٹی پانی دیتے تھے اور اس کے سسر تو غدر میں ہی مارے گئے۔کون پوچھنے والا تھا۔وہ بھی یہی کام کرتے تھے ان کا تو چھپر بھی نہیں بچا۔اب آج کل ہماری اماں پڑی ہیں۔جاؤ سلام کر آو تمہاری تو نانی ہوئیں۔۔''

میلی سی گٹھری میں حرکت ہوئی

''کون ہے شاکر؟؟؟''

گھر کے ایک ایک ذرّے سے غربت ٹپک رہی تھی۔ہر طرف افلاس اور بیچارگی تڑپ رہی تھی۔

''ماموں ایک گلاس پانی ملے گا؟''

''ہاں ابھی لو'' انہوں نے المونیم کے گندے پچکے سے گلاس میں گھڑے سے پانی انڈیل کر میری طرف بڑھایا۔

''۔۔اچھا اب اجازت دیجے۔۔اختر میاں کھڑے ہو گیے

''ٹیکسی کھڑی ہے''۔۔

''گاڑی سے آئے ہو؟؟؟؟''

ماموں بے اختیار باہر آئے۔۔اختر میاں ان کو سلام کر کے ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

''مگر صاحب آپ تو ٹھہرنے والے تھے؟''ٹیکسی ڈرائیور نے دل دکھانے والا سوال کر ہی دیا۔۔

''جن صاحب سے ملنا تھا وہ نہیں ملے چلو واپس''۔۔

جس وقت اختر میاں واپس پاکستان پہونچے سورج ڈوب رہا تھا،اک اداسی سی چھائی ہوئی تھی مگر ان کے گھر آنے سے ایک دم چہل پہل سی ہوگئی بچّے دوڑ کر لپٹ گئے۔امّاں خاموش خاموش سی انھیں دیکھے گئیں،ان کے چہرے پر ایک ہی سوال تھا۔۔

''کیا تم وہاں گئے تھے؟؟۔۔کیا تم؟؟۔۔''

اور تبھی اختر میاں آکر ان سے لپٹ گئے۔۔۔

''کیسی ہیں امّاں آپ؟؟۔۔ارے میرے پیچھے تو آپ دبلی ہوگئی امّاں۔ میں تو اپنے کاموں میں اتنا مصروف ہوگیا کہ مرادآباد جا ہی نہیں سکا۔ ہاں مہرو خالہ، نے یہ سامان بھیجا ہے وہ بہت یاد کرتی ہیں آپ کو۔''

امّاں نے ایک گہری سی اطمینان کی سانس لی اور اٹھکر مہرو خالا کا بھیجا ہوا سامان کھولنے لگیں۔

☆☆☆

وضع دار

لکھنؤ کے ایک پرانے محلّے میں ہمارے کچھ عزیز رہتے تھے یا رہتے
ہیں کیونکہ بقول بشیر بدرؔ ۔

انہیں میری کوئی خبر نہیں مجھے ان کا کوئی پتہ نہیں۔۔۔

یہ کافی پہلے کی بات ہے اس محلے میں ایک بہت بڑا پھاٹک ہوا کرتا تھا۔جس کے اوپر دونوں طرف پتھر کی بڑی بڑی مچھلیاں بنی تھیں۔پھاٹک کے کونوں میں اتنی جگہ تھی جیسے کہ چھوٹے چبوترے جن پر بیٹھ کر ہم اور رخسانہ گُٹّے کھیلتے تھے۔پھاٹک کے اندر سامنے بہت بڑا کچّا صحن تھا اور بائیں ہاتھ کی طرف بہت بڑی صحنچی اور کئی دروں کے دالان تھے غالبًا پرانے زمانے میں کسی نواب کا زنان خانہ رہا ہوگا اس کی بناوٹ کچھ ایسی ہی تھی۔اس میں پورا

محلّہ بسا ہوا تھا۔داہنی جانب ایک راستہ تھا جس میں دونوں طرف کچھ گھر بنے تھے جونسبتاً اچھے تھے اور اس میں متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے۔

ان گھروں میں ایک گھر آمنہ خالا کا تھا۔آمنہ خالاہماری دورکی رشتہ دار تھیں اماں کے رشتہ کے ماموں یا چچا کی بیٹی اس رشتہ سے ہم انھیں آمنہ خالا کہتے تھے۔

ان کا گھرکافی بڑا اور کھلا کھلا سا تھا۔خوب بڑا سا صحن جس میں لال اینٹوں کا فرش ایک طرف نیچی سی دیوار جس میں داخلی دروازہ دوسری طرف دالان اور ایک طرف بڑے بڑے دوکمرے اور کچن۔ آنگن کے ایک کونے میں امرود کا پیڑ بھی ابھی تک یاد ہے۔

کچن کا فرش سمینٹ کا تھا بے حد چکنا اور صاف شفاف۔کئی صاف ستھری پیڑھیاں رکھی تھیں۔ہمیں آج بھی یاد ہے کہ مٹی کے لپے پتے چولھے پر آمنہ خالا باریک چپاتیاں پکارہی ہوتیں اور بے تکان اماں سے باتیں کرتیں ہم اور رُخسانہ تام چینی کی پھول دار پلیٹوں میں وہیں پیڑھی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ارہر کی بگھری دال اور سفید موتی جیسے چاول۔کیا ذائقہ تھا آمنہ خالا کے ہاتھ میں اس کے بعد آج تک وہ ذائقہ نصیب نہ ہوا۔

آمنہ خالا اچھی خاصی تندرست خاتون تھیں سرخ سفید رنگ، ناک کے پاس ایک موٹا سا مسّہ بے حد گھنے گھونگھروالے بال جنہیں وہ ایک ربر بینڈ میں قید کرتیں مگر چہرے پربکھربکھرآتے۔خالو دبلےپتلےاوربےحدمسکین تھے وہ اکثر آمنہ خالا سے جھڑکیاں کھایا کرتے مگر خاموش رہتے

۔ان کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔

اس دن کافی گرمی تھی لائٹ ہمیشہ کی طرح غائب تھی ہم اور رخسانہ گھر کے باہر کچے صحن میں کھیل رہے تھےتبھی بڑے زور کی بارش شروع ہوگئی اس شدید گرمی کے بعد وہ بارش خداکےحسین تحفے کی طرح ہم نے ہاتھوں اور سروں پر لی خوب بھیگ بھیگ کراُسی پانی میں کھیلتے رہے کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔

اماں نے کئی بار دروازہ کھول کرہم کو ڈانٹا اور کہا کہ نہاکر کپڑے بدل لو مگر کون سنتا ہے شام کا اندھیرا چھانے لگا تو دل بری طرح گھبرایا اسی وقت اماں اور آمنہ خالا گھر سے نکلیں خوب عمدہ کپڑے پہنے اس پر برقعہ اوڑھے وہ دونوں کہیں جارہی تھیں۔

''ہم بھی جائیں گے۔'' ہم اور رخسانہ ان کے پیچھے دوڑے۔

مگر وہ دونوں رکشہ میں بیٹھ کر آگے چلی گئیں ہم بے تحاشہ ان کے پیچھے دوڑتے رہے مگر رکشہ تیز ہوتا گیا ہم دونوں روتے رہے اور رکشے کے پیچھے پیچھے دوڑتے رہے پھر اماں نے نقاب اٹھا کر ہمیں ڈانٹا۔

''پہلے کہا کہ نہاکر کپڑے بدل لو تو نہیں بدلے اب گھر جاؤ واپس۔''

رکشہ بہت آگے چلا گیا ہم روتے ہوئے گندے سندے گھر آئے اور بغیر بستر کی چار پائیوں پر لیٹ کر سو گئے ہم کو زور کا بخار چڑھا تھا کب اماں آئیں کب اٹھا کر ہمیں دودھ پلایا دوا کھلائی کچھ یاد نہیں صبح جاگے تو طبیعت بہتر تھی۔

دوسرے دن ہم لوگوں کو واپس جانا تھا۔آمنہ خالا صبح سے تیاریوں میں مشغول تھیں کئی چیزیں انھوں نے ہمارے ساتھ کیں ہمیں نئی فراکیں بھی دیں۔ رات کے کھانے میں بے حد اہتمام کیااورساری دوپہرکچن میں مصروف رہیں موسم نسبتاً اچھا تھا آنگن میں پلنگوں پر سفید چادروں کے بستر بچھادیئے گئے تھے ہم اور رخسانہ ایک بستر سے دوسرے بستر پر کود رہے تھے اور چادر خراب ہونے کی وجہ سے اماں ہمیں مسلسل ڈانٹ رہیں تھیں

۔آنگن میں بڑی سی میز پر دسترخوان بچھایا گیا اورآس پاس کر سیاں لگا کر کھانے کا اہتمام کیا گیا سبھی بہن بھائی پلنگوں پر کرسیوں پر بیٹھے ہنس رہے تھے باتیں کررہے تھے خوب لطیفے سنائے جارہے تھے آج خالو بھی کافی دنوں کے بعد سب کے ساتھ آکر بیٹھے اور اماّں سے باتیں کر رہے تھے ہم اور رخسانہ بھی بچھڑ جانے کے خیال سے گھبرا رہے تھے اور نہ جانے کیا کیا عہد و پیماں کررہے تھے۔عشرت باجی اور رفعت باجی نے کھانا ٹیبل پر لگانا شروع کیا تو ہم اور رخسانہ دوڑ دوڑ کر پلیٹیں چمچ گلاس وغیرہ لگانے لگے۔پلاؤ کباب قورمہ سلاد سبھی چیزیں تقریباً آچکی تھیں۔آمنہ خالا شاہی ٹکڑے نکال رہی تھیں اور مستقل باتیں کئے جارہی تھیں تبھی ایک عجیب واقعہ ہوا۔

دروازے کی زنجیر کسی نے کھٹ کھٹائی افضال بھائی نے بڑھ کر دروازہ کھولا ایک صاحب ایک دم سے اندر آگئے انھوں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔لمبا قد خوبصورت گورے چٹّے سے آدمی تھے عمر میں شاید افضال بھائی کے برابر ہی کے ہونگے یاشاید چند برس بڑے ہونگے سفید کرتا

پائجامہ پہنے ہوئے تھے اس پر سُرمئی رنگ کی کافی قیمتی لیکن میلی سی شیروانی بھی پہنی تھی پیروں میں چمڑے کے بدوضع جوتے تھے جو ان کے خوبصورت پیروں میں بالکل سوٹ نہیں کر رہے تھے۔

وہ بغیرایک بھی لفظ بولے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے اور پلیٹ میں کھانا نکالا اور جلدی جلدی کھانے لگے ان کی انگلیاں بے قراری سے کپکپارہی تھیں مگر کھانا وہ بے حد تمیز سے کھا رہے تھے۔سب لوگ ہکا بکا کھڑے تھے مگر ان کی شخصیت ایسی تھی کہ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ان سے کچھ کہے یا انہیں گھرسے نکالے۔ایک طرف خالو خاموش کھڑے ان کو کھانا کھاتے دیکھ رہے تھے دوسری طرف اماں مبہوت تھیں انھیں‌اس وقت پردے کا بھی بالکل خیال نہیں تھا۔خالا اپنی دُھن میں بولتی ہوئی شاہی ٹکڑے لئے ہوئے کچن سے برآمد ہوئیں

اور ''اوئی بیوی'' کہہ کر وہیں رک گئیں۔

کھانا کھا کر ان صاحب نے جگ اپنی طرف کیا اور گلاس میں پانی انڈیلنے لگے اس درمیان بھی انھوں نے کسی طرف نہیں دیکھا کئی گلاس پانی پی کر وہ کھڑے ہو گئے اور پھرانھوں نے سب کی طرف دیکھا اور خالو کی طرف بڑھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئے خالو گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹے تو انھوں نے خالو کے قدم تھام لئے......اور آنسوؤں بھری آواز سے بولے:

''اب آپ مجھے کوئی بھی سزا دیجئے یا پولیس میں دے دیجئے......یا پھر معاف کردیجئے میں آپ کے سامنے ہوں۔میں پانچ دن سے مارا مارا پھر

رہا ہوں پہلے بھُنے چنے تھے تین دن پہلے وہ بھی ختم ہوگئے بھوک سے میرا بُرا حال تھا گدا گری میرا پیشہ نہیں اور محنت کرنا مجھے آتا نہیں ہے اپنے اجداد کا نام بتا کر میں ان کی روحوں کو شرمندہ نہیں ہونے دونگا......ہو سکے تو میری اس جسارت کو معاف کردیجئے گا۔''

ان کی زبان ان کا لہجہ ان کا انداز، ہر ایک فرد رقّتِ آنگیں تھا اماں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور آنسوؤں سے چہرہ تر تھا آمنہ خالا کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔خالو نے انھیں دونوں شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کرسی پر بٹھالیا ان سے کچھ اور کھانے کی درخواست مگر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور

''اجازت چاہتا ہوں'' کہہ کر دروازے کے اندھیرے میں گم ہوگئے۔ سب لوگ چند منٹ تک سناٹے میں کھڑے رہے کسی کو کھانا کھانے کا ہوش بھی نہیں رہا سبھی کے ذہنوں میں معصوم صفت غریب لیکن بے حد شریف شخص کے دل پذیر الفاظ گونج رہے تھے اور رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔

آج بھی جب کبھی گھر میں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے تو میری نظریں اچانک دروازے کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ نہ جانے کیوں...........؟

☆☆☆

گردشِ ایّام

آج بھرپورے چاند کی رات ہے۔

کچے بادام اور خوبانیوں کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ پہاڑ پر پھیلے ہوئے لمبے چوڑے درختوں کے سبھی پتے گر چکے ہیں اور وہ برف کے خوف سے خود بخود سہمے سہمے سے کھڑے ہیں۔کسی کسی درخت کا آخری پتہ ابھی تک اس کی ڈال پر کپکپا رہا ہے۔زندگی کے راستوں کی طرح یہ پہاڑی ٹیڑھے میڑھے راستے بھی بے حد دشوار گزار ہیں۔

پتا نہیں لوگ اتنا کیسے ہنس لیتے ہیں۔میں نے پاس بیٹھے ہوئے ان دونوں لڑکوں کو دیکھا جو کئی بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کر چکے تھے اور

اب ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کسی بات پر بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔میں نے بے دھیانی میں ان کا چہرہ دیکھا پھر جیسے آنکھوں میں دھندسی سمانے لگی سب کچھ دور محسوس ہونے لگا۔زندگی بہہ رہی ہے بہتی جارہی ہے ڈَل جھیل کی لہریں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتی آگے بڑھ جاتی ہیں
۔پانی پر ٹھہرے بلبلے ایک پل میں بکھر جاتے ہیں۔پرانی زندگیاں ختم ہوجاتی ہیں ایک لہر مرتی ہے دوسری سامنے آتی ہے۔پیلی سرسروں کے پیلے پھول جب میں اس کے بالوں میں سجا کر اسے گھما دیتا تھا دیکھ دیکھ کتنی پیاری لگتی ہے جیسے سرسوں کا کھیت......یا پیلی
پیلی سرسوں، اور وہ وقت گزرگیا۔ وہ وقت گزرا نہیں بلکہ مرگیا...... سارے لمحے مر گئے، بچپن مرگیا، بے فکری زندہ دلی مرگئی، وہ پھول وہ بال سب ختم ہوگئے۔

پھردوسرا وقت آیا وہ محبتیں وہ شرم وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر دل میں اٹھتی لہریں، وہ سارے سمندر سوکھ گئے، وہ سارا وقت جو مرگیا۔پرانی زندگی ختم ہوتی ہے نئ زندگی سامنے آتی ہے۔نئے حالات سخت چٹیل دھول بھرے میدان جیسے حالات۔ میں......وہ سب جو آس پاس چل پھر رہے ہیں کیا وہ زندہ ہیں......بس صرف آج زندہ ہے......آج جس میں اپنا کچھ نہیں ہے۔بس ایسا ہی ہے۔اسی آج سے سب کو جوجھنا ہے۔سامنے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ رہا ہوں پانی کے بلبلوں میں میری زندگی کے میری خوشیوں کے سارے دن چمکتے ہیں......وہ دن جب وہ میرے ساتھ تھی، وہ دمکتے دن،وہ روشن راتیں اس کی خوشبو،اس کا لمس،اس کا احساس سب کچھ چھوڑ کر میں چلا گیا......اس

اکیلے پن میں کوئی نہیں جو مجھے میرے کاندھے پر سر رکھ کر چھوٹے چھوٹے قصے سنائے جو ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ رکھ کر میری باتیں دھیان سے سنے، میرا دل بہلانے کے لئے تاش اٹھا لائے، دیر تک میرے ساتھ رمی کی بازیاں کھیلے اور میں جان جان کر ہارتا جاؤں، اس کا چہرہ جیت کی خوشی سے دمکنے لگے۔

دل کی نازک شاخ یادوں کے بوجھ سے جھکتی جاتی ہے۔ننھی سی نجو...... ہر طرف نظر آتی ہے۔نام تو اس کا نجم السحر تھا مگر میں تو اسے ہزاروں ناموں سے بلاتا تھا نجّو......نجّی......نجمی اور بھی کئی نام رکھے تھے میں نے اس کے۔

جب اس کی امی کا انتقال ہوا تو وہ بے حد بیمار تھی۔تیز بخار سے چہرہ تپ رہا تھا۔پڑوس میں گھر ہونے کی وجہ سے اس کے پاپا اسے سوتا ہوا کندھے سے لگائے میرے گھر لے کر آئے تھے۔روتے روتے ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔انہوں نے بخار میں تپتی نجم السحر کو ممی کے پاس لٹاتے ہوئے کہا تھا :

''گھر پر بہت کہرام ہے۔پلیز اس کا خیال رکھئے گا۔''اور ممی نے اسے اپنے آنچل میں لے لیا تھا۔جب اسے سوتا دیکھ کر ممی اُس کے گھر کی طرف چلی گئیں تو میں اس کی چار پائی کے ارد گرد گھومتا رہا اس کا بخار سے تپتا چہرہ میرے اندر آگ برسا رہا تھا۔پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور تڑپ کر اٹھ گی......

''وجّو میری اماں...........''

''کیوں کیا ہوا آنٹی کو وہ تو ٹھیک ہیں'' میں نے اس کے بال سہلائے۔

''تم لیٹ جاؤ۔''

اس نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں میں اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں اپنے دامن سے صاف کرتا رہا۔اس کے بالوں کو سمیٹتا رہا اس کے دکھوں کو اپنے ننھے سے ذہن میں سمیٹتا رہا۔

زندگی باہیں پھیلائے ہمیں بُلا رہی تھی ہم زندگی کو قریب سے دیکھتے دیکھتے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔جیسے ان پہاڑوں کے سلسلے ایک دوسرے کو چھوتے ہوئے مگر صاف شفاف سفید اور پاکیزہ جیسے ہمارے جذبے۔

وقت بہت آگے بڑھ آیا ہے اور وہ......کب کی بچھڑ چکی ہے۔ میں خود ہی اس پیارے چمکتے ہوئے پہاڑی سلسلوں کو چھوڑکرانسانوں کے جنگلوں میں بھٹکنے نکل آیا ہوں۔پتہ نہیں کیسی جستجو ہےکیسی کھوج ہے کہ قرار نہیں۔ نہ جانے کتنے پڑاؤ سامنے آئے کتنی محبتوں نے راستہ روکا مگر دل میں اک پھانس سی کھٹکتی رہی وہ مجھے یاد کرتی ہوگی، روتی ہوگی، انتظار کرتی ہوگی، اس کی یادوں کی کچی کلیاں ہرشب تکیہ کے پاس رکھ کرسوتا رہا اسی کے خواب دیکھتا رہا............

معاشرے میں اپنا مقام بنانا بھی کوئی آسان بات نہیں ہے۔نجمی کو اچھا مستقبل دینے کے لئے یہ تو کرنا ہی تھا......

زندگی کو حقیقتوں کی نظر سے دیکھنا تھا۔

ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ وقت میرے ہاتھ میں ہے۔

مگر جب دس برس بعد واپس آیا تو......سرسوں کے پھول سوکھ چکے تھے، مرچکے

تھے، اس کی شادی اپنے خالازاد بھائی سے ہو گئی تھی۔ اس ان دیکھے شخص سے مجھے شدید نفرت محسوس ہوئی اور یہ شکوہ بھی لبوں پر خود ہی آ گیا۔

''تھوڑا انتظار تو کیا ہوتا............''

پھرخود ہی جواب دے لیا۔

میں نے انتظار یا اعتبار کا ایک بھی پھول تو اس کی جھولی میں نہیں ڈالا تھا

۔ہر طرف اس کی یادیں بکھری تھیں۔تمام جھیلوں کا پانی شل شل بہہ رہا تھا وہاں پر اس کی سسکی کی آواز سنی میں نے......لمبے چوڑے چیڑ کے سفید درخت کے تنے پر چاقو سے کھدے ہوئے دو نام.....نجّو،وجّو......وہ اسی درخت سے ٹیک لگائے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے روتی روتی نظر آئی مجھے......وہ میرے جاتے وقت دوڑ کر پیچھے نہیں آئی۔اسے اپنا وقار اپنی عزت میری دربدری سے زیادہ عزیز تھی۔وہیں پیڑ سے لپٹی روتی رہی وہ چیڑ کا سفید درخت......

آج کٹ چکا تھا............

اس کی جڑوں کے پاس کی مٹی گیلی تھی جیسے اس کے آنسو اب تک نہ سوکھے ہوں۔میں زمین پر بیٹھ گیا ہوں۔

کہیں سے آ کر مجھے گلے لگا لو۔میرے آنسو سوکھ چکے ہیں میں پتھر کا ہوتا جا رہا ہوں، سینے میں سخت درد محسوس ہو رہا ہے......

یہ مندر والی پہاڑی کے نیچے اتنا مجمع کیوں ہے......؟

یہ تو شاید ماسٹرجی کا گھر ہے میں جلدی جلدی نیچے اترنے لگتا ہوں......دروازے پر کافی بھیڑ ہے......

''کیا بات ہے صاحب......؟''

میں نے ایک بزرگ سے پوچھا......وہ مڑے......

''وہ ماسٹرجی تھے''

ان کی آنکھوں میں حسرتوں کے آئینے ٹوٹ رہے تھے......آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں......

''اب آئے ہو بیٹا......''

انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا......

''نجم السحر بٹیا ختم ہوگئیں......''

دھڑ دھڑ میرے اندر اک الاؤ سا جلنے لگتا ہے۔ دروازے پر ایک چار سال کی بچی ایک صاحب کے پیروں سے لپٹی کھڑی سسک رہی ہے

''ابو......امی کو کیا ہوگیا......''

دکھوں سے نڈھال وہ شخص دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ پانچ سال کی نجم السحر مجھ سے پوچھ رہی ہے......

''میری امی کو کیا ہوگیا وجّو.................؟''

میں اس چھوٹی سی بچی کو گود میں اٹھا لیتا ہوں وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی ہے......اور تب آنسو کو راستہ مل جاتا ہے......اسے سینے سے لگا کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہوں۔

☆☆☆

ہائیڈ پارک کے ذرد پتّے......

اُداسی کی تیز لہر میرے دل کو کاٹ رہی تھی اور میں پناہ لینے کے لیے ادھر اُدھر چکر لگا رہا تھا- پارک اس وقت ویران تھا-لندن کے اس پارک کی خاصیت اس کے درخت اور ان کے بڑ ے سائز کے پتّے ہیں اس کے علاوہ وہیں سڑک پر پارک کے جنگلے سے لگا کر ایک آرٹسٹ اپنی پینٹگنس سجا لیا کرتا تھا- پارک کے بیچوں بیچ ایک مصنوعی تالاب بنایا گیا ہے جس میں رنگ برنگی بطخیں تیرتی رہتی ہیں-

جی ہاں رنگ برنگی......پہلی بار جب میں نے انہیں دیکھا تو مجھے بھی بے حد حیرت ہوئی تھی لیکن جب میں نے انہیں ان کی خوراک (جو کہ میں نے وہیں سے ڈبے میں خریدی تھی) دینے کے لیے پاس بلایا تو وہ پر پھڑ پھڑاتی قریب آئیں اور میں قدرت کا یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ گیا- یہ سارے

رنگ حقیقی تھے جیسے تتلی کے پر......اس دن مجھے بطخوں کو کھانا کھلانا اتنا اچھا لگا کہ میں روز بلا ناغہ وہاں آتا اور تالاب کے کنارے بیٹھ کر انہیں دیکھتا رہتا' کھلاتا رہتا

-اک عجیب سا سکون اور اپنائیت تھی اس ماحول میں شاید باغوں کھیتوں تالابوں کو چھوڑ کر آنے کی وجہ سے میں انہیں جڑوں سے کٹ کر رہ گیا تھا- اور یہی وجہ تھی کہ اس پارک کے اس پُر سکون گو شے میں بیٹھ کر مجھے سب کچھ یاد کرنے کا کافی وقت ملتا تھا- اکثر میں ان بڑے بڑے پتّوں کو جمع کرتا رہتا اور سوچتا کہ جب میں واپس ہندوستان جاؤں گا تو یہ پتّے تمنّا کو دوں گا وہ بہت زیادہ خو ش ہوگی۔تمنّا میری چھوٹی بہن کا نام ہے۔ وہ پُر اسرار حد تک قدرت کی شیدائی ہے۔ رنگوں اور خوبصورت پتّوں کی متلاشی......تصویروں اور پرندوں کے رنگ برنگے پر جمع کرنے والی میری پیاری تمنّا......مگر اس درمیان حب میری دوستی لوسی سے ہوگئی تو میرے پاس ہائیڈ پارک کے لیے وقت بہت کم رہ گیا......لوسی سے میری ملاقات بارش میں بھیگتے ہوئے سڑک پر ہوئی تھی۔ وہ سڑک کچھ ڈھلوان تھی اور میں ہمیشہ کی طرح پیدل......چھتری شاید اُس کے پاس بھی نہیں تھی جبکہ لندن کے موسم کا تقاضہ ہی ہے کہ چھتری ہر وقت پاس ہونی چاہیے دراصل صبح سے موسم بالکل صاف تھا دھوپ چمک رہی تھی- میں اسی لیے کاہلی میں بغیر چھتری لیے کام پر چلا گیا اور واپسی میں اچانک زوردار بارش شروع ہوگئی-

ہاں تو بات ڈھلان کی تھی' اچانک لوسی کا پیر لڑکھڑا گیا یہ شرارت شاید اس کی اونچی ہیل کے سینڈل کی تھی اور میں نے اُسے تھاما تو وہ نازک شاخ کی طرح میری باہوں میں آ گئی- اس کا چہرہ تمتما رہا تھا- سلیقے سے کٹے ہوئے بال اس کے چہرے پر پھیل رہے تھے- براؤن آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی- میرا فلیٹ کیونکہ قریب ہی تھا میرے کہنے پر وہ میرے ساتھ آ گئی......

سجا سجایا خوبصورت وسیع فلیٹ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ

گئیں......کہاں سڑک پر معمولی پیدل چلنے والا ہندوستانی......اور کہاں یہ شاندار فلیٹ......میں نے بھی اس کو کوئی صفائی نہیں دی......یہ ہماری پہلی ملاقات تھی- پھر وہ اکثر مجھے ملنے لگی اور ہماری دوستی میں زیادہ دیر نہیں لگی......اکثر وہ اپنے کام سے دوپہر کو فارغ ہوتی تھی اور میرے فلیٹ پر آ کر میرا انتظار کرتی ایک چابی اس کے لیے بنوانا تو میرا فرض تھا......وہ میری اچھی دوست جو تھی- اس دن جب میں گھر آیا تو وہ کچن میں کچھ کھٹ پٹ کر رہی تھی شاید وہ نہا کر آئی تھی باتھ روم کا دروازہ بھی کھلا تھا- باہر موسم بہت اچھا ہو گیا تھا میرا ارادہ تھا کہ اس کو لے کر کہیں گھمانے لے جاؤ ں گا اس لیے اپنے دوست سے ایک کھٹارا کار بھی مانگ کر لے آیا تھا جب وہ کچن سے بھاگتی ہوئی آ کر بھیگے رخساروں، بھیگے بالوں سمیت مجھ سے لپٹ گئی تو میرے سارے ارادے ٹوٹ پھوٹ گیے ۔اس دن میں نے پہلی بار اس کے گلابی لبوں کو چوما تھا- اور تب مجھے معلوم ہوا کہ میں لوسی کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں- اس نے میری پسندیدہ ڈشیز سے ساری ٹیبل بھر دی......کئی کھانے بنا لیے تھے اس نے......

''کیوں کیا تم نے یہ سب......''میں نے اسے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

تمہیں اچھا نہیں لگا......؟

بہت اچھا لگا لوسی......بہت اچھا......میں واقعی بہت خوش تھا- کھانے کے بعد اس نے میری پسندیدہ سویٹ ڈش پائین ایپل کسٹرڈ بھی لا کر رکھ دی......کھانا کھا کر ہم لمبی ڈرائیو پر نکل گیے......دریائے ٹیمز کے کنارے ٹہلتے ہوئے میں نے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا......''لوسی......آ ؤ شادی کر لیں......''میں نے بڑے جذبوں سے اسے پرپوز کیا......''شادی......؟'' وہ ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہو گئی......اس کی نگاہوں میں اک عجیب سی بات تھی جو میں سمجھ نہ سکا......

ہاں لوسی......میرا دوست جیک آنے والا ہے......وہ کسی کورس کے لیے نیو یارک گیا ہوا

ہے یہ فلیٹ اسی کا تو ہے......اب وہ آنے والا ہے اب ہم دونوں تمہارے چھوٹے سے کمرے میں کچھ دن گزاریں گے اس کے بعد......مگر اس نے میری کوئی بات پوری نہیں ہونے دی......میں نے اس کی طرف دیکھا وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں جو چیز میں نہیں سمجھ پایا تھا اچانک میں سمجھ گیا اس کی آنکھوں میں میرے لیے تضحیک تھی گلابی ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی......

''تم نے ایسا سوچا بھی کیسے......تم ہو کیا......تمہاری حیثیت کیا ہے......وہ جانے کیا کیا کہتی رہی میں سنتا رہا......اس نے اپنا ہاتھ بہت پہلے میرے ہاتھوں سے نکال لیا تھا اور جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی......میں شرمندہ بھی تھا اور حیران بھی مگر رنجیدہ ہونے کا میرے پاس نہ وقت تھا نہ موقع ......اور اپنی روڈ آتے ہی اس نے مجھے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے بغیر کچھ کہے اُتر گئی......اُترتے وقت وہ فلیٹ کی چابی اپنی خالی سیٹ پر رکھنا نہیں بھولی تھی۔

میں اسٹیرنگ پر ہاتھ دھرے اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا دور......اور دور...... بہت دور......معلوم نہیں میں کیسے گھر آیا...... بہت دیر تک ایک ہی رخ پر بیٹھا رہا......میرے بدن میں درد ہو رہا تھا...... پھر سر میں شدید درد ہونے لگا......کافی بنانے کی ہمت بھی نہیں ہوئی...... پھر پتہ نہیں کب سو گیا......

خواب میں میں نے اماں کو دیکھا وہ میرے لیے بے قرار نظر آئیں......اپنی دونوں بہنوں کو دیکھا جو میرے لیے بے چین تھیں پھر صاف شفاف بستر پر لیٹے اپنے بیمار ابو کو دیکھا جو آنکھوں میں بہت سی تمنّائیں لیے مجھے دیکھ رہے تھے جنہوں نے مجھے یہاں کچھ بننے کے لیے بھیجا تھا ان کی ساری توقعات مجھ سے ہی وابستہ تھیں- میرا کورس تقریباً پورا ہو گیا تھا اور میں نے یہاں جاب کی بات بھی ایک کمپنی میں کر لی تھی عنقریب میں ان لوگوں کے خوابوں کو پورا کرنے والا تھا- مجھے ملنے والی اچھی تنخواہ سے بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی اور یہاں بھی یہ فلیٹ کیا اس سے لاکھ درجہ اچھا

فلیٹ میں افورڈ کر سکتا تھا بس میری بہنوں کا گھر بس جائے ابّو کے سر سے ذمہ داری کا بوجھ اتر جا ئے اماں کے سنجیدہ لبوں پر پہلے کی طرح ہنسی بکھری رہے جیسی ابو کی بیماری سے پہلے بکھری رہتی تھی۔

صبح اٹھ کر سب سے پہلے میں نے لوسی کا سارا سامان پیک کیا گھر اچھی طرح صاف کیا پھر کار واپس کرنے گیا تو اس کا سامان اس کی لینڈ لیڈی کو دیتا ہوا آیا- آج پھر میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنے پرانے دوستوں سے ملوں......اس لیے میں پھر اپنے پرانے ٹھکانے پر آ گیا......دیر تک اپنی دوست بطخوں کو کھانا کھلاتا رہا وہ سب کی سب مجھ سے اتنے دن نہ آنے پر ناراض لگ رہی تھیں مگر میں نے ''سوری......سوری'' کہہ کر انہیں منا لیا......اچانک میری نظر ایک کونے میں پڑی بینچ پر پڑی--جس پر ایک کم سن سی معصوم لڑکی اکیلی بیٹھی تھی......اس نے گہرے نیلے رنگ کا لبا س پہنا تھا-اس کے بے پناہ حسین چہرے پر اس کے سنہرے بال ہوا سے بکھرے جا رہے تھے اس کا اس کا رف کھل کر بینچ پر گر چکا تھا-وہ ویران آنکھوں سے خلا میں دیکھ رہی تھی......اس کے ہاتھوں میں بھی ایک چھوٹا سا ڈبّہ تھا جس میں بطخوں کا کھانا تھا......مگر وہ شاید بھول چکی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے- میں نے اتنا حسین چہرہ اس طرح سوگوار کبھی نہیں دیکھا تھا......میں آہستہ سے جا کر اس کی بینچ کے نزدیک نیچے گھاس پر بیٹھ گیا اُسے خبر نہیں ہوئی-

''ہیلو............'' میں نے مدھم سُر میں اسے پکارا......

''آں......ہاں ہیلو......'' وہ اچانک چونک سی گئی پہلے اس نے اپنے کپڑے سنبھالے پھر اس کا رف اٹھایا ہاتھ میں لیا ہوا ڈبّہ نیچے گر چکا تھا......میں نے وہ اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا-

''تھینک یو......'' اس نے ہلکی سی آواز میں میرا شکریہ ادا کیا اس کی گہری گہری سنہری آنکھیں کسی سوگ میں تھیں یا مجھے ایسا لگا شاید میں اُداس تھا تو مجھے ساری دنیا اُداس لگ رہی تھی-

''میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا ہوں-؟''

''اوہ نو...... تھینکس ......'' وہ زبردستی مسکرائی اور نارمل نظر آنے کی کوشش کرنے لگی- میں اٹھ کراسی بینچ پر ایک کنارے بیٹھ گیا- ہم دونوں خاموشی سے بطخوں کو کھانا کھلاتے رہے پیاری پیاری رنگین تتلیوں جیسی بطخیں ہمارا دل بہلانے کی کوشش کرتی رہیں- پھر دھیرے دھیرے ہم ان کی باتیں کرنے لگے پھر ہم پارک کی خوبصورتی پر بات کرنے لگے یہاں بیٹھے سناٹے پر بات ہو ئی...... پھر نہ جانے کب ہم اپنی باتیں کرنے لگے...... میں نے نہ جانے کیوں اپنے دل کا سارا حال اسے سنادیا......اپنی اداسی کا سبب شروع سے آخر تک اسے کہہ ڈالا......وہ بہت صبر سے سب کچھ سنتی رہی پھر اس نے بہت پیار سے میرا ہاتھ چھو کر مجھے تسلی آمیز نظروں سے دیکھا......اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری تھیں- جیسے سنہری جھیلیں...... پھر اس نے ایسی ہی ایک داستان سنائی ......جو اس کی اپنی تھی......نوید ہندوستان سے یہاں وزٹ ویزے پر آیا تھا اس نے لیزا سے کانٹر یکٹ میرج کر لی یہاں جاب کرنے لگا اور پھر......''وہ بہت پیار کرتا تھا مجھے......'' لیزا اب بھی خواب میں تھی۔

''پھر نہ جانے کیا ہوا اس کے گھر سے کوئی خط آیا......وہ مجھے چھوڑ کر چلا یا گیا......کل اس نے فون پر مجھے طلاق کا لفظ تین بار کہا......اس سے کیا ہوتا ہے......کیا ایسا کہنے سے سب کچھ ختم ہو جاتا ہے-؟ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں......درمیان میں کچھ نہیں بچتا میری کنواری محبت کا یہ انجا م تھا...... میں نے اسے ٹوٹ کر چاہا مجھے کیا ملا......؟'' اس نے اپنی گلابی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں پر رکھ لیں اس کا چہرہ غموں سے جل رہا تھا......سسکیوں سے اس کا سارا بدن لرز رہا تھا- میں نے اسے چپ نہیں کیا......اسے رونے دیا...... میں چاہتا تھا وہ خوب روئے......خوب روئے تاکہ میری طرح اس کا بدن نہ ٹوٹے......اور پھر وہ کبھی نہ روئے......اور یہی میں نے اس سے کہا لیزا تم

میرے کاندھے پر سر رکھ کر رو سکتی ہو...... مجھے اپنا دوست سمجھ کر......اور اتنا رو لو......کہ پھر تمہیں کسی کاندھے کی ضرورت نہ پڑے...... میں نے اس کی سنہری زلفیں انگلیوں سے سنوار دیں......اس کی پلکوں پر چمکتے ہوئے موتی پوروں میں اتار لیے......اس کے گلابی معصوم چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنی چوڑی سانولی ہتھیلی سے ڈھانپ لیا......اور اسی وقت بارش شروع ہو گئی...... پانی میرے ہاتھوں سے ہو کر اس کی ہتھیلی کو بھگو رہا تھا ہم دونوں بھیگ رہے تھے چھتریاں بنچ پر پڑی رہیں ہم دونوں بھیگتے رہے- پھر اس نے میرے ہاتھوں سے ہاتھ نکال لیا......اور ٹھنڈی سانس لے کر کھڑی ہو گئی......وہ کافی پر سکون نظر آ رہی تھی۔

''کافی پیو گی......؟''میں نے اپنا تھرمس کھولا......

''نہیں......-''لیزا نے اپنا سارا سامان سمیٹا......اور مسکرا کر میری طرف دیکھا-

''کیا آج تم مجھے کسی اچھے ہوٹل میں لنچ نہیں کرواؤ گے-''

اس کے چہرے پر اک ایسی مسکراہٹ تھی جیسے شدید بارش کے بعد دھوپ نکل آئی ہو...... پلکوں اور بالوں پر بارش کے قطرے چمک رہے تھے......اور ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ لیے...... پارک سے باہر نکل رہے تھے......ہمارے پیروں تلے سنہرے پتے چرمرا رہے تھے...... امید اب بھی کہیں باقی تھی......زندگی پھر جینے کے لیے ہمک رہی تھی-

راہ میں ہم ملیں کہاں ......؟

''شانو! کہتے ہیں کہ جذبے اپنا اثر ضرور ڈالتے ہیں''......وہ مجھے پچھلا کوئی واقعہ سنا رہی تھی جذبہ اچھا ہو یا برا......مگر دوسرے پر اپنا اثر ضرور ڈالتا ہے۔

اگر ہم کسی کے بارے میں اچھی رائے رکھیں اور ایسے اچھے الفاظ میں یاد کریں تو وہ بھی بہر حال ہمیں اچھی ہی امیدوں میں یاد رکھے گا- اور جسے ہم قابل توجہ نہ سمجھیں، عام طور پر اُسے بھی ہمارا کوئی خیال نہیں ہوتا......اور جب جذبے شدید ہو جائیں؟

تو اثر بھی شدید ہو جاتا ہے۔

اور یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔

بہت بے ضرر سی بات تھی کہ وہ اچانک ہی کہیں نہ کہیں مجھے مل جایا کرتا تھا- بس بالکل

اچانک......اور عام طور پر اُس وقت جب بھی میں کسی مشکل میں ہوتی تھی - پتہ نہیں کیسے بس اچانک ہی......

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے - اِرم......؟'' مجھے حیرت تھی -

''ہاں شانو......عام طور پر ایسا نہیں ہوتا......وہ سوچتی ہوئی آواز میں بولی مگر میرے ساتھ ہوا ہے......''

''اور مجھے جذبوں کی سچائی پر پورا یقین ہے'' - وہ آہستہ آہستہ جیسے نیند میں بول رہی تھی - اور میں اس کی بھاری بھاری پلکوں پر اُن لمحوں کا بوجھ محسوس کر رہی تھی جو بات اس کے دل میں نہ جانے کب سے زخم بن کر رہ گئی تھی...... جو آج میرے بے حد پوچھنے پر وہ بتا رہی تھی شاید اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی تھی......کسی جذبے کی کمی تھی جو اسے رہ رہ کر اتنی پرانی باتیں یاد آنے لگی تھیں - یہ سب اُس پرانے شہر کی باتیں تھیں جہاں ہم دونوں ساتھ رہے تھے ساتھ پڑھے اور ساتھ ہنسے روئے تھے۔ ''بس! نہ جانے کیا ہوتا تھا...... میں کہیں بھی جا رہی ہوتی تھی......

کسی بھی سڑک پر......کسی لائبریری کسی پکچر ہال میں اور وہ اچانک ہی مل جاتا......اور میں اُس وقت ضرور کسی نہ کسی مشکل میں گھری ہوتی تھی۔

کوئی راستہ کھو جاتا......تو وہ بتاتا......اگر لائبریری میں دیر سے کوئی کتاب نہ مل رہی ہوتی......تو وہ خاموشی سے بنا کچھ پوچھے وہی کتاب اوپر کی کسی ریک سے نکال کر مجھے تھما دیتا -

جب سہیلیوں کے ساتھ پکچر ہال میں ٹکٹ کی پریشانی ہوتی تو وہ..''

''ہاں مجھے بھی یاد ہے...... اُس دن رضیہ سلطان دیکھنے کے لیے، ہم لوگ کس قدر ایکسائیٹڈ تھے......اور ٹکٹ سے مایوس ہو گئے تھے تب کوئی......''

''ہاں'' - اس نے میری بات کاٹ دی

''تب بھی وہی تھا...... بالکل وہی......ٹکٹ ہمارے ہاتھ میں تھما کر جانے کہاں چلا گیا تھا۔''

''یاد ہے،ہم نے پکچر ہال میں اسے کتنا ڈھونڈا تھا......؟

مگر وہ کہاں تھا۔ پھر میں بھول بھال گئی پڑھائی میں گھر گئی......''

وہ تکیوں کے سہارے تھوڑا بیٹھ گئی......

''میں نے اس کے بارے میں اتنا کبھی نہیں سوچا مگر آج جب تم مل گئی ہو تو تمہارے چہرے کے پیچھے مجھے وہی چہرہ بار بار نظر آ رہا ہے......شاید اس لیے کہ تم اُسی شہر کو چھوڑ کر آئی ہو...... تمہارے پاس وہیں کی خوشبو ہے......یا شاید......''

''ایک بات پوچھوں اِرم؟ تم اپنی زندگی سے خوش تو ہو..؟'' آخر وہ سوال میرے ہونٹوں پر آ ہی گیا جسے میں بہت دیر سے ٹال رہی تھی اور وہ ہنس دی......عجیب سی ہنسی......اور دیر تک ہنستی رہی......

''ہاں شانو......میں خوش ہوں بہت خوش......میرا اپنا گھر ہے مجھے چاہنے والا شوہر ہے......تمہیں تو معلوم ہے کتنی مشکلیں اٹھا کر اس نے مجھے اپنایا ہے۔تم تو جانتی ہو کتنا فساد کھڑا ہوا تھا جب شہروز نے اپنا پرپوزل بھیجا تھا۔''

''ہاں مجھے یاد ہے......مجھے تو وہ کل کی بات لگتی ہے کہ......'' میں اتنا ہی کہہ سکی تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی......''تمہیں کل کی بات لگتی ہے شانو؟ اس بات کو تو صدیاں بیت گئیں......شہروز کہیں کھو گیا ہے شانو......'' وہ تھک سی گئی تھی آواز میں اک ایسی بے چارگی تھی کہ میں لرز گئی......

''تمہیں کیا ہوا ہے اِرم......؟''

''مجھے کچھ نہیں ہوا......شہروز کو ہوا ہے وہ مجھ سے بہت دور جا رہا ہے آہستہ آہستہ مجھے اپنے

آپ سے الگ کر رہا ہے اس کی ایک ایک بات میں بیزاری ہے اور میں ان ننھی منّی زنجیروں میں جکڑی جا چکی ہوں......اب انہیں کیسے الگ کروں اپنے آپ سے......میں کیا کروں شانو......؟''

''تم مجھے اُس اجنبی کے بارے میں اور بتاؤ......'' میں اس کا دھیان دوسری طرف کرنا چاہتی تھی......

''پتہ نہیں کیوں برسوں بعد مجھے اس کی یاد کیوں آ رہی ہے......شاید اس لئے کہ اُس نے ہمیشہ زندگی کی مشکلوں میں میرا ساتھ دیا ہے......اور اس وقت بھی میں مشکلوں میں گھری ہوں۔ ہاں شانو......وہ فرشتہ ہی تو ہے......میرے لیے تمہیں یاد ہے ایک شام جب میں ہوسٹل سے اپنی لوکل گارجین کے گھر جا رہی تھی تم نے بھی کئی بار منع کیا تھا کہ موسم خراب ہے آج مت جاؤ مگر اُس دن میرا دل بہت گھبرا رہا تھا اور میں عفّت باجی کے گھر بچوں کے ساتھ دھیان بٹانے کی غرض سے چل دی تھی......راستے میں پتہ ہے کیا ہوا تھا؟'' وہ پھر نہ جانے کہاں......پانیوں کے سفر پر چل پڑی تھی......

''رکشہ والا بہت تیز رکشہ چلا رہا تھا۔ اور اُس راستے پر عجیب سا سناٹا اور ویرانی تھی میں بار بار اس کو آہستہ چلانے کے لیے کہتی مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا میں بے حد گھبرا رہی تھی۔ اور اس گھبراہٹ میں پتہ ہے کیا ہوا۔؟''

''کیا......؟'' میں بے اختیار پوچھ بیٹھی

''میرا دوپٹہ جو گلے میں لپٹا ہوا تھا اچانک ہی رکشے کے پہیے میں آ گیا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا اور میری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی......رکشہ والے نے خود بھی مڑ کر دیکھا اور گھبرا کر رکشہ روکنے لگا تبھی......اسی وقت نہ جانے کہاں سے وہ سامنے آ گیا......یقین کرو پہلے تو اس کی سائیکل مجھے نظر نہیں آئی جبکہ میں نے کئی بار اِدھر اُدھر دیکھا تھا اور اچانک وہ سامنے تھا......رکشہ کے پاس کھڑا میرا دوپٹہ نکال رہا تھا پھر اس نے دوپٹہ جھاڑ کر میرے سر پر ڈال دیا......وہ لمحہ میں کبھی بھول

نہیں اس کی...... جب بھی مجھے یاد آ تا ہے احساس تشکّر سے میرا دل بھر آ تا ہے- اُس وقت میں اپنے آ پ کو کتنا بے بس محسوس کر رہی تھی اس کے یوں آ جانے سے جیسے میں معتبر ہو گئی- اس نے رکشہ والے کو بہت ڈانٹا اور پھر خاموشی سے ہمارے رکشہ کے ساتھ ساتھ سائیکل پر چلتا رہا......

اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا کچھ نہیں کہا...... حالاں کہ شناسائی کے تقاضے وہ مجھے ڈانٹ بھی سکتا تھا یہی کہتا کہ مجھے اس موسم میں نکلنے کی کیا ضرورت تھی مگر وہ بغیر کچھ کہے سنے عفت باجی کا دروازہ آنے سے پہلے ہی پلٹ گیا شکریہ کا ایک بھی لفظ سنے بغیر...... جیسے یہ سب اس کا ہی کام ہو اسی کا فرض ہو...... جیسے وہ...... بس آگے میں سوچ نہیں سکتی مگر تم خود سوچو یہ کوئی بات ہوئی......''

''مگر ارم کیا تمہیں اُس سے محبت ہے؟'' میں نے ذرا رک کر کہا...... ''نہیں شانو...... محبت بار بار نہیں ہوتی یہ جذبہ اتنا سستا نہیں ہے- محبت مجھے ضرور ہے مگر وہ ساری کی ساری شہروز کے لیے ہے اور اس رشتے کے علاوہ کوئی اور رشتہ...... کوئی اور رابطہ...... میری سمجھ سے بالاتر ہے- اور مجھے وہ ملا تھا تب بھی میں شہروز کو ہی چاہتی تھی میرے خوابوں میں شہروز کے علاوہ کوئی نہیں تھا دور دور تک کوئی نہیں...... اور یہ تم بھی جانتی ہو......''

''مگر تم اسے بھول کیوں نہیں پائیں......؟'' مجھے بہت دکھ ہو رہا تھا-

''کوئی اپنے محسن کو بھول سکتا ہے؟ اور اگر بھول سکتا ہے تو وہ بہت احسان فراموش انسان ہوگا - اور پھر وہ محسن جس نے مجھے جانے بوجھے بغیر میری مدد کی بے لوث مدد......؟''

''پھر وہ کبھی ملا......؟'' مجھے حیرت تھی۔

''ہاں...... اس نے مجھے فون کیا تھا...... جب میرا فائینل ایر تھا میں گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی چپراسی نے آ کر بتایا میرا فون ہے میں حیران تھی- فون کس کا ہو سکتا ہے- شہروز تو ابھی مجھ سے مل کر گیا ہے- فون پر جب میں نے اسے ہیلو کہا...... تو ایک گمبھیر سی آواز سنائی دی

......' آپ اِرم بول رہی ہیں......؟'

'جی......؟' میں اب بھی حیران تھی کیونکہ آج سے پہلے میں نے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی میں تو بس اس کا چہرہ پہچانتی تھی خوبصورت آنکھیں سنہری رنگت لمبا قد......اک مہربان وجود......اور بس اس سے زیادہ غور سے میں نے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا-

'میں بول رہا ہوں......جو ہر موڑ پر آپ کو مل جاتا ہوں......؟' اس کی آواز اُس کا لہجہ ایسا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو......

'میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں......آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔' اس کے لہجے میں حکم نہیں اک ملائم سی التجا تھی۔

مگر مجھے ایسا لگا کہ اگر میں اس سے مل لی تو یہ سارا طلسم ختم ہو جائے گا میں خوابوں اور تصوروں کی دنیا میں رہنے والی......اک اکیلی لڑکی......جس کا سارا وقت کتابیں پڑھنے اور تصویریں بنانے میں گزرتا تھا......وہ حقیقت کے اُجالے میں آنے سے گھبرا رہی تھی۔

'نہیں پلیز......میں جس ماحول میں رہ رہی ہوں وہاں لوگ اس طرح کی دوستی پسند نہیں کرتے پھر میں تو ہوسٹل میں رہتی ہوں اور یہاں پر اس طرح کی دوستی اچھی نہیں سمجھی جاتی۔'

'اور شہروز......؟' اس کے لہجے میں تجسّس کے ساتھ کوئی ایسی بات تھی جو مجھے بری لگی۔

'شہروز میرے دوست نہیں......میرے ہونے والے شوہر ہیں......ہماری شادی بہت جلد ہونے والی ہے۔'

'سوری......اِرم......وری سوری میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا- پھر بھی میں ملنا چاہتا ہوں آپ سے'

اور میں نے فون رکھ دیا......نہ جانے کیوں میرا دل نہیں چاہا کہ اور بات کروں اس

کے بعد مجھے وہ ملا بھی تو بہت دور سے......صرف دیکھنے کے لئے -''کب......''میں پھر بول اٹھی ......اس کی خاموشی جیسے گھٹن پیدا کررہی تھی -اور میں سب کچھ جان لینا چاہتی تھی -

''شادی کے ۱۵سال کے بعد......ابھی چند ماہ پہلے......ہم کئی لمحوں تک ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہے......پھر میں نے پوچھ ہی لیا......

'آپ............؟'

'ہاں......وہ مسکرایا......میں وہی ہوں'ہم دونوں کے بیچ صدیاں بیت گئیں......یادیں زندہ ہوکر کھڑی ہوگئیں......اس کے ہاتھوں میں میرا الجھا ہوا دوپٹہ تھا جسے وہ بڑے احترام سے مجھے اڑھا رہا تھا -اس کے ہاتھوں میں پکچر کے ٹکٹ تھے......اس کے ہاتھوں میں میری کتاب تھی

'کیسی ہیں آپ؟'پہلی بار اس نے میرا حال پوچھا......

کیا حال بتاتی اسے -زندگی کا کون سا کونا تھا جو اسے دکھاتی......خاموشی سے سر جھکائے چائے بناتی رہی......''

''اور کوئی بات نہیں ہوئی......؟''

''نہیں شانو......بس ایک بات اور......کہ اس نے اپنے بیٹے کا نام بتایا تھا مجھے......''اِرم نے اپنی بیٹی سمیرا کو اٹھا کر دوسری طرف لٹاتے ہوئے کہا......

''کیا نام ہے اس کے بیٹے کا......؟''مجھے اس کی خاموشی سے اکتا کر پھر پوچھنا پڑا..

''سمیر......یہی نام ہے اس کے بیٹے کا''......وہ مسکرائی اور حسرت سے بولی''اور میں منتظر ہوں کے وہ پھر کہیں سڑک کے موڑ پر وہ آئے اور پریشانیوں اور فکروں میں الجھا ہوا میرا دوپٹہ پھر سے میرے سر پر ڈال دے -کیا وہ مجھے کہیں پھر سے مل سکے گا -؟بولو شانو؟''میں اس کے اس سوال کا کیا جواب دوں......؟

☆☆☆

نگہبان۔۔۔

ایک فلاسفر نے کہا تھا ''میں سوچتا ہوں اس لیئے میرا وجود ہے''

درخت جاندار ہوتے ہیں مگر کیا وہ سوچ سکتے ہیں؟؟؟

وہ ہماری فیملی کا ایک ممبر تھا۔کوئی سمجھے نہ سمجھے ہم تو سمجھتے تھے اور ہم ہر خوشی ہر غم اس کے ساتھ بانٹتے بھی تھے۔اس کا ہر دکھ ہمیں اپنا لگتا تھا۔ چاہے اس کے پتّے گر رہے ہوں یا کوئی شاخ ٹوٹ جائے۔۔ہمیں دکھ ہوتا تھا، ہاں۔۔۔وہ ایک برگد کا پیڑ تھا۔

حالانکہ یہ صرف ہماری بات نہیں وہ بھی ہماری خوشیوں پر جھوم جایا کرتا تھا۔۔اور ہر غم پہ اداس ہو جاتا۔اور یہی وجہ تھی کہ کبھی اس کی لکڑی یا پتّے جلائے نہیں گئے۔ہم اس برگد کے پیڑ کی بات کر رہے ہیں جو ہمارے گھر کے باہر ایک نگہبان کی طرح ہمارے اوپر سایہ کیئے ہوئے نہ جانے کتنے برس

سے کھڑا تھا۔

جب یہ گاؤں آباد ہوا تب سے یہ پیڑ یہاں پر تھا جب دادا نے گھر بنوایا تب بھی یہ ایسے ہی مسکراتا رہا۔۔۔ ہاں تب یہ جوان تھا۔ اس کا تنا گہرے ہرے رنگ کا تھا پتّے گہرے ہرے رنگوں کے علاوہ بارش میں سنہرے بھی ہو جاتے تھے۔

اس کا ایک اسپیشل پھل بھی ہوا کرتا تھا۔۔ جسے لوگ ''گودا'' کہتے ۔۔۔ پہلے چھوٹی چھوٹی ہرے رنگ کی گولیاں، پھر رفتہ رفتہ ان کا سائیز بڑھ کر چیکو کے برابر ہو جاتا، ان کا رنگ گہرا عنّابی سا ہو جاتا تھا۔ ذائقہ کچھ زیادہ اچھا تو نہیں ہوتا تھا مگر بچپن میں تو ہر چیز اچھی لگتی ہے نا؟؟

بچپن میں ہم اس کے سائے میں کھیلتے تھے اور یہ بارشوں اور دھوپ سے بھی بچا کر رکھتا۔ اس کی موٹی شاخوں میں ہم جھولا ڈلواتے اور پینگوں کا مزا لیتے۔ رات کو گھر کے بڑے بھی جھولے میں آجاتے۔۔ دن کے وقت تو انھیں باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔

برگد کے اس پیڑ میں چڑیوں نے بھی بہت سارے نشیمن بنا رکھّے تھے، پیاری پیاری رنگ برنگی چڑیاں اس گھر کے تنے میں گھر بنا کر رہتیں۔ رات کو جب اندھیرا ہو جاتا تو پورے پیڑ میں جگنو چمکنے لگتے۔۔ ڈھیر سارے جگنو۔۔ ہر طرف ان کی نرم نرم روشنی سی پھیل جاتی۔ بہت ساری گلہریاں بھی اس میں چھپی رہتی تھیں۔۔ ان کے ننھے ننھے بچّے شاخوں پر ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔۔

اسی برگد کے نیچے ہم نے سائیکل چلانا سیکھی۔۔ دوپہر میں جب سب لوگ مزے سے نیند لے رہے ہوتے تب ہم برگد کے نیچے سائیکل دوڑاتے پھرتے۔۔

وہی ہمارا کھیل کا میدان تھا وہی اسکول، اور وہی تفریح گاہ جہاں آکر ہم گم ہو جاتے۔
ایک شام تھی غالباً سردی کا زمانہ۔۔ جب ہوائیں چلنے لگیں اور پھر وہی ہوائیں آندھیاں بن گئیں

ہم اندھیوں کے خوف سے گھر کے دالان میں خاموش بیٹھے تھے۔لالٹین بھی بار بار بجھ جاتی تھی۔۔ ہمار برگد جھوم جھوم کر گھر کو آندھیوں سے بچا رہا تھا۔۔۔اور پھر ایک دلداوز چیخ سنائی دی۔۔۔برگد جڑ سے اکھڑ رہا تھا۔۔گرر ہا تھا۔۔۔سب کو مدد کے لیئے پکار رہا تھا۔۔مگر اس کی مدد کون کرتا۔۔۔ ایک شور سا برپا تھا۔

ہزاروں ٹن بھاری۔۔۔بے پناہ شاخیں۔تنے کا حجم تقریباً تیس فٹ رہا ہوگا اسے کون تھام لیتا؟؟؟ کون ہاتھ بڑھا تا اس کی طرف؟ وہ جب تک رہا سب کے کام آیا اور اب کوئی نہیں تھا جو اسے بڑھ کر تھام لے۔۔؟

اور پھر آخری کراہ کے ساتھ وہ دروازے کے سامنے پہلے گھٹنوں کے بل اور پھر سارا کا سارا گر پڑا۔۔گرتے گرتے بھی اسے ہمارا خیال رہا اور وہ دروازہ چھوڑ کر گرا۔۔۔

آپ۔۔کیا محض اتفاق کہینگے۔۔؟

اتنا بھاری بھرکم درخت اگر گھر پر گر جاتا تو گھر تہس نہس ہو جاتا۔مگر وہ جانتا تھا۔۔۔ اسے خیال تھا ہمارا۔۔وہ دوسری طرف گرا۔۔اور مر گیا۔

ہاں ہم وہ تو یہی کہتے ہیں کہ وہ مر گیا۔۔ چلا گیا ہمیں چھوڑ کر۔۔سائبان نہ رہا۔لکڑی کٹنا شروع ہوئی تو مہینوں کٹتی رہی بہت ساری چڑیوں کے گھونسلے۔۔ٹوٹے ہوئے انڈے مری ہوئی چڑیاں۔۔اور تو اور کئی سانپ بھی زندہ اور مردہ حالت میں ملے۔۔

اس کے پتے مدّتوں نہیں سوکھے۔ہم اس کے غم میں کئی برس بےچین رہے۔۔ہم اپنے گھر کو اس پیڑ کے بغیر سوچ بھی نہیں پاتے ہیں۔۔

آج بھی ایک پتہ۔۔۔ایک سرخ سا پتّہ جو میرے دل کے اوپر سلگ رہا ہے شاید اسی برگد کے پیڑ کا ہے۔

☆☆☆

خواہشوں کے زرد جنگل

بھوک اتنی شدید تھی کہ لگتا تھا یہ زندگی کا آخری دن ہے۔

''کچھ صاف نظر نہیں آرہا ہے۔''

صوفیہ نے بندہوتی ہوئی پلکوں کوبمشکل کھولا اورعدیل کی طرف دیکھا جو ہاتھوں کاتکیہ بنائے پارک کی ہری بھری گھانس پربےحس وحرکت پڑا تھا وہ ڈرسی گئی۔

عدیل......کیا ہوا تمہیں......؟وہ بیقراری سے آگے بڑھی اور اس نے عدیل کا شانہ ہلایا وہ ٹھنڈی سانس لیتا ہوا اٹھ گیا......اس کی آنکھیں پانیوں سے بھررہی تھیں ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔چہرے پر مایوسیوں کے تاریک سائے پھیل رہے تھے......

''کیا ہے......بولو......''اس کی آواز میں کمزوری اورمایوسی گونج رہی تھی۔

ایسا کرتے ہیں......صوفیہ نے تھک کرسانس لی......مرجاتے ہیں۔

کیا......؟ عدیل نے چونک کر اسے دیکھا۔

ہاں عدیل ایسی زندگی کا کیا کریں......اسی طرح سسک سسک کر کیسے اور کب تک جئیں گے......کب تک ہم کھانے پینے کی چیزوں کویوں ہی ترستے رہیں گے آخر کب تک وہ حد درجہ مایوس نظرآرہی تھی۔

زندگی کا یہ بھی عجیب دور تھا۔بہت اچھا وقت بھی گذارا تھا انھوں نے اور اسی لئے صوفیہ کسی طرح عدیل کو مزدوری کرنےنہیں دیتی تھی...... مگر اب تو مایوسی حدسے بڑھ گئی تھی......جینا مشکل ہوگیا تھا اب وہ زندگی نہیں گزار رہے تھے بلکہ زندگی انھیں گزار رہی تھی۔

دونوں نے خاندان کی مخالفت کرکے شادی کرلی تھی اور چھوٹا سا سپنوں کا گھربسائے اپنے شہرسے بہت دور چلے آئے تھے۔شروع شروع میں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔عدیل نے کچھ جمع کئے ہوئے پیسوں سے اور صوفیہ کے زیور بیچ کر سرچھپانے کو ایک کمرے کا چھوٹا سا گھرخرید لیا تھا بس شاید یہی عقلمندی کی تھی انھوں نے جس کی وجہ سے انھیں گھر سے بے گھرکوئی نہیں کر سکتا تھا۔ایک کمرے کا گھر جس میں بالکونی کو کور کرکے عدیل نے کچن بنالیا تھا اس میں ایک باتھ روم جس میں ساتھ ہی ٹوائلٹ تھا اور کچھ نہیں تھا۔مگر وہ گھر ان دونوں کے لئے جنت سے کم نہ تھا کیونکہ انھیں اور کسی بات کی فکر نہ تھی۔جبکہ دیواریں بھی مخدوش تھیں لیکن بنواتا کون جیسا تھا بس ان کا اپنا گھرتھا گو کہ وہ اسے اپنی پسندکا رنگ بھی نہیں دے سکے تھے پھربھی امیدیں بہت تھیں۔سوچا تھا کہ عدیل کوئی ملازمت

کرے گا یا صوفیہ کو کسی اسکول میں نوکری مل جائے گی مگر یہ سب اتنا آسان نہ تھا......نیا شہرنئے لوگ۔عدیل نے کئی جگہ مزدوری بھی کی اپنی انا کو کہیں پیچھے ڈال دیا......لیکن کام بھی تو روزنہیں ملتا ......اور بھوک تو روز ہی لگتی ہے۔ جب وہ شام کو تھکا ہارا گھرآتا اور صوفیہ اس کامنہ دیکھتی تو بغیر کسی سوال کے دال چاول کی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دیتی جوکہ ڈبے کے آخری کونے میں کہیں پڑے ہوتے پھروہ وقت بھی آگیا کہ جب ہر ڈبے کا آخری کونہ بھی خالی ہوگیا۔صوفیہ بھی برابرنوکری کی کوشش کررہی تھی مگر نئے شہرمیں چھوٹے سے چھوٹے اسکول میں بھی اسے نوکری نہ مل سکی جبکہ وہ گریجویٹ تھی اور اپنے شہر میں ایک اچھے خاصے اسکول میں ملازمت کررہی تھی اور جہاں اس کی اور عدیل کی اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی اور پھر وہ ملاقات دوستی میں بدل گئی اور پھر......لیکن یہ ایک الگ کہانی تھی جس کی صرف یادیں باقی تھیں......یادیں......جس میں نشہ ہوتا ہے......بڑا دلنواز نشہ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے ایسا نشہ کرنے کو......مگر بھوک میں کوئی نشہ یاد نہیں آتا اب تو یہ حال ہے کہ کیسا نشہ کیسے خواب......اب تو ہر جگہ ایک ہی چیز نظرآرہی تھی روٹی روٹی......اور صرف روٹی......صوفیہ کی مایوسی دیکھ کرعدیل کا دل بیٹھنے لگا......

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو صوفیہ......؟''

میں سچ کہہ رہی ہوں میں تھک گئی ہوں ہار گئی ہوں عدیل......اس نے بڑی حسرت سے عدیل کی طرف دیکھا۔

اب جینے کا مطلب زندگی کی ذلّتوں کو گلے لگانا ہے اور ذلّت سے جینے سے

اچھاہے کہ.....موت آجائے.....اور خود تو موت آنے سے رہی.....اس کے لئے بھی کچھ کرنا پڑے گا عدیل.....اس نے بڑی مشکل سے ہونٹوں پر مسکراہٹ سمائی اورعدیل کا ہاتھ تھام لیا۔

''آؤخودکشی کرلیتے ہیں۔''صوفیہ نے بڑی ہمت کرکے کہا۔

عدیل ہنس پڑا.....مگر اس کی ہنسی بھی اتنی ہی خالی تھی جتنی کہ اس کی جیب.....اسوقت دونوں تھک کرپارک میں بیٹھے تھے جہاں ہرطرف پھول ہی پھول تھے وہ دونوں ہار سنگھار کے پیڑکے نیچے بیٹھے تھے جوکہ پورا کا پورا نارنجی ڈنڈیوں والے سفیدپھولوں سے لدا ہواتھا چاروں طرف اس کی خوشبو پھیل رہی تھی مگراس وقت ان کو دنیا کی سب سے اچھی خوشبو کی ضرورت تھی.....کیا کھانے کی خوشبو سے اچھی بھی کوئی خوشبو ہوتی ہے؟نہیں نا؟

کاش کہیں سے یہ خوشبوآجائے.....کاش!

پھرایک لرزا دینے والا خیال عدیل کے دل میں آیا کہ اگر کسی طرح آج بھوک مٹ بھی جائے تو کل پھرلگے گی.....اور یہی سوچ کر عدیل تڑپ کربیٹھ گیا اس نے صوفیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں زور سے پکڑلیا.....

ہاں صوفی.....اب برداشت نہیں ہوتا.....مگر ہم زہربھی کہاں سے لائیں.....؟

''ایساکرو عدیل اپنا گھربیچ دیتے ہیں.....''صوفیہ نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔

گھر.....؟عدیل کولگاجیسےاس کےسرپرکوئی بوجھ آگرا ہے.....مگروہ پل بھرمیں سنبھل گیا۔

پھررہیں گے کہاں صوفیہ.....

رہنا کہاں ہے......؟وہ استہزائیہ ہنس پڑی۔مرجائیں گے اسی پارک میں پولیس کی گاڑی لیجائے گی......پھرچاہے جو بھی ہو......

عدیل سرجھکائے مجرموں کی طرح بیٹھا رہا......پھرایک جھٹکے سے اٹھا اورصوفیہ کاہاتھ پکڑکرگھر کی جانب چل پڑا۔

سب کچھ طے ہو گیا......پاس کے ہوٹل والے نے دولاکھ کا گھرصرف پچاس ہزار دےکر خرید لیا پچاس ہزار روپے دیکھے بھی انہیں زمانہ گزر گیا تھا آج اتنے پیسے ہاتھ میں آئے تو دونوں جیسے ہوش و حواس کھوبیٹھے...... صوفیہ تو سسکیاں لے کر رونے لگی......عدیل نے کانپتے ہاتھوں سے ان پیسوں کو صوفیہ کے پرس میں ڈالا اور اسے کاندھوں سے تھام کر گھرسے باہر نکل آیا......ارمانوں سے لیا گھرخالی کردیا......وہ سب سے پہلے صوفیہ کو لے کر اس کی پسند کے ریسٹورنٹ میں گیا جہاں دنوں نے کھانا کھایا پھر کافی منگوائی اور آنکھیں بندکرکے دیرتک خاموش بیٹھے رہے......نیند سی آنے لگی تھی شدید بھوک میں نیند کہاں پوری ہوتی تھی صوفیہ نے مخمورنگاہیں اٹھاکر عدیل کو دیکھا تو وہ بے پناہ خوبصورت نظرآرہا تھا......اس کے چہرے پر سکون اور خوشیاں صاف نظرآرہی تھیں۔ اس نے اٹھ کر بل دیا اور صوفیہ کا ہاتھ پکڑکرباہر نکل آیا......کھلی ہوا میں وہ کچھ سوچنا چاہتے تھے......کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے...... ایک دن اور ایک رات وہ جی بھرکے خوشیاں مناناچھاہتے تھے۔

ہوٹل میں کمرہ لینے کے لئے انہیں سامان کی بھی ضرورت تھی......اور وہ سارا سامان وہیں چھوڑآئے تھے۔اس نے بازار سے ایک نیا سوٹ

کیس خریدا اور صوفیہ کے لئے ایک بہترین لباس ......صوفیہ نے شوروم میں چاروں طرف گھوم کرایک اچھا سا سوٹ خریدا......اور دونوں نے مسکراکرایک دوسرے کو دیکھا یہ کپڑے اب کون......اورکب پہنے گا......کیا خبر......؟صوفیہ نے ایک پرفیوم کی بوتل بھی لے لی۔

فائیواسٹار ہوٹل میں کمرہ لینے کے بعد جب وہ دونوں اندر آئے تو اک عجیب سی مسرت اورآزادی کا احساس ان کے ساتھ تھا......بستر پر بیٹھ کر صوفیہ نے عدیل کے کاندھے پرسر رکھ دیا اور رونے لگی پھرروتی ہی چلی گئی......عدیل کچھ کہے بغیراس کا سرتھپکتا رہا......نرم سفیدتولیے سے اس کا چہرہ صاف کرکے اس نے اسے گلابی سوٹ پہنایا تو واقعی پرانی صوفیہ لوٹ آئی عدیل نے اسے پرفیوم میں نہلادیا تھا......دونوں بچوں کی طرح خوش ہورہے تھے عدیل نے بھی نئے کپڑے پہن لئے تھے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہورہے تھے......

خوب سوکراٹھنے کے بعد دونوں نہاکرشہر گھومنے نکل پڑے......

چلوآج سارا دن گھومتے ہیں شہرکو پیسوں سے دیکھتے ہیں......پیسوں سے شہردیکھنے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ہے نا صوفی......؟

دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑکرگھومتے رہے......سارا دن گھوم کرتھک گئے اب پھرسمندر کے کنارے پہونچ گئے تھے پیسے بھی تقریباً ختم ہوگئے تھے نہ جانے کہاں کہاں گئے کیا کیا خریدا۔اس وقت وہ کچھ یاد نہیں کرنا چاہتے تھے شام سمٹنے لگی تھی......سائے طویل ہونے لگے تھے۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک شیشی زہر کی بھی خرید لائے تھے......

دن بھرانھوں نے بچوں کی طرح ہنسی خوشی وقت گزرا تھا جس میں کوئی الجھن نہیں تھی خوب آئسکریم کھائی جھولے پر بیٹھے رہے.....سمندر کے کنارے سیپیاں چنیں......اور صوفیہ نے اپنے پرس میں رکھ لیں عدیل ہنس رہاتھا وہ مسکرارہی تھی......اونٹ کی سواری......ناریل پانی.....آج وہ کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے......چاٹ بھی خوب کھالی تھی......اب تو رات کے کھانے کی جگہ بھی نہ تھی......رات کے نوبج گئے تھے......روپے بچ گئے تھے......سمندر کے پاس بیٹھا ہوا فقیر بڑی حسرت سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔صوفیہ نے بڑی فیاضی سےسو روپئے کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا تو وہ حیران ہو کراسے دیکھنے لگا.....مگرصوفیہ نے نوٹ اس کے دامن میں ڈالا اور آگے بڑھ گئی......

مگررات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاموشی اترآئی تھی دونوں کے بیچ۔کیا سوچ رہی ہو......؟

کچھ نہیں...........

وہ اپنی ساری کشتیاں جلاچکے تھےاب کہیں جانے کا راستہ نہیں تھا......میں یہ سوچ رہی تھی کہ پانی کہاں ملے گا؟ صوفیہ نے آہستہ سے کہا۔

کیوں......وہ رہانل تمہیں پانی چاہیے......عدیل نے اسے پیار سے چھوا۔

ہاں......اور تمہیں بھی......زہر پینے کے لئے...... اس کے ہونٹوں پر مضمل سی مسکراہٹ تھی۔صوفیہ نے پرس سے بوتل نکالی اور عدیل کی طرف بڑھادی...... عدیل نے بوتل ہاتھ میں لے کر ایک لمحہ سوچا......پھربازو گھما کر پوری طاقت سے سمندر کی طرف پھینک دی.....صوفیہ نے حیران نظروں سے

اسے دیکھا......اس نے اپنا سرصوفیہ کے کاندھے پر رکھ دیا......

''صوفیہ......میرے اندرامید کی ایک کرن جاگی ہے ہم پھر گھربنا لیں گے یہ مرنے کا کام خدا پرچھوڑ دیتے ہیں...... وہی جو چاہے کرے......

☆☆☆

روٹی کپڑا اور مکان

بھوراکھردرا میلاکچیلاکمبل اسکوکاٹنے لگا تھا۔

مگر پھربھی اس نے کمبل چاروں طرف سے لپیٹ لیا......ہٹ جانے پرمچھربری طرح بھنبھوڑنے لگتے نیندنہ پوری ہونے سے اسے چکرآتے اور پھر رات کی ڈیوٹی سے ہاتھ ٹوٹنے لگتے پیروں میں جان نہیں رہتی......اس لئے وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح انہیں نیند کو ان مچھروں سے بچا لے وہ باربار اپنا کمبل پیروں پر برابرکرتا اور اس کے پھٹے ہوئے ٹکڑے سے پھر مچھرآنے لگتے......ایک عجب سی بے بسی اس پر طاری ہوئی اور تبھی اک خیال اچانک اسے چھوگیا کل اس کی قید کا آخری دن ہے اور پھرآزادی......نہ جان توڑمحنت نہ مچھرنہ بھوک نہ نیند کا غم......آہ......اس نے پھرکراہ کرکروٹ بدلی......آخرنیندآ کیوں نہیں جاتی......وہ کمبل جھٹک کر بیٹھ گیا......کل سے یہ

سب ختم......یہ تکلیف دہ راتیں اور دن......بیکار کی جھڑکیاں......ڈانٹ پھٹکار......سب کچھ ختم...... وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا رات کا آخری پہر سست روی سے گزر رہا تھا سارے قیدی نیند میں ڈوبے ہوئے تھے......اپنی اپنی تکلیفوں سے آزاد سبھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے......اک وہی تھا جس کا دل بے چین تھا جسے کسی صورت قرار نہ تھا۔اس کے سامنے وہ سارے دن اپنی تقدیر کی سیاہیاں لئے کھڑے تھے جنہیں چھوڑ کردہ یہاں آیا تھا......دن بھر ادھراُدھر گھومنا شام ڈھلے خالی ہاتھ لئے گھر آنا بیوی کی جھنجھلاہٹ بچوں کی رحم کی بھیک مانگتی آنکھیں پھیلے ہاتھ ٹھنڈا چولھا..اُف......کہاں تک کہاں تک چھوٹی موٹی چوریاں کرنے سے بھی کچھ نہ ملا......اور ملی تو یہ جیل ملی وہ بھی جب ایک سیٹھ کی جیب کاٹتے وقت اس کے چیخنے چلانے سے پولیس آ گئی اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ماربھی خوب پڑی......جیل بھی ہوئی تین ماہ کی جیل ہوئی ۔ایک ماہ بعد جب جگو بھی جیل میں آ گیا جو اس کا جگری دوست تھا تو معلوم ہوا بیوی کو اس کا بھائی لے گیا بچے ماموں کے پاس گاؤں گئے گھر پر مالک مکان کا قبضہ ہوگیا......اب کیا بچا......کچھ بھی نہیں......بس وہ اور اس کی حسرتیں گھر میں آسودگی کا خواب......اور اب جیل سے چھٹی ہو رہی تھی تو......کہاں جانا ہے......روٹی کے لئے ترسنا کام نہ ملنا سب کی جھڑکیاں......جیل سے نکلنے کا لیبل چور کا لیبل ماتھے پر سجا کر کام کا ڈھونڈنا......

صبح کا اجالا اپنا اثر دکھا رہا تھا اس نے ایک گلاس پانی پیا......چاروں طرف چڑیوں کی چہکار تھی......اب قیدی کام کے لئے جگائے جا رہے تھے......ایک......گارڈ ڈنڈے سے مار مار کر سب کو جگا رہا تھا......اس نے نہ جانے کیا سوچ کر پاس پڑی لوہے کی

راڈ اٹھالی اورگارڈ کے سر پر بھرپور وار کردیا......وہ چکرا کر گرا......شاید وہ مر چکا تھا ہر طرف شور ہوگیا قیدیوں نے اسے گھیرلیا تھا گارڈ اس کو مارتے ہوئے جیلر کے پاس لے جا رہے تھے۔مگر اس نے اپنے سر چھپانے کا اور روٹی کا انتظام کرلیا تھا۔

☆☆☆

ٹوٹتی دیواریں

''ای لوٹا بکئے آوارہئے۔''

غریب خستہ تن خستہ پیرہن علاقے کے سُنار علادین کے ہاتھوں میں بڑا سا سنہرا لوٹا کانپ رہا تھا۔اس لوٹے پر رانی صاحبہ کا نام کھدا ہوا تھا علاقے میں اسے بیچنے کی ہمت کس نے کی ڈیوڑھی کی زنجیر کھٹکھٹا کر جب منشی جی نے لوٹا اندر بھجوایا تو حویلی میں ہلچل مچ گئی۔اک یہی نہیں کافی دنوں سے بڑی حویلی کی کئی چیزیں علاقے میں دستیاب ہوئیں کچھ برتن کچھ ہلکے زیور مگر جب سامان کی کوٹھری میں سیندلگی اور سونے چاندی کے زیوروں کے ساتھ رانی صاحبہ کے پرانے اشرفی ٹکے غرارے اور کرتے چوری ہوئے تو ان کا صبر جواب دے گیا۔ایک ایک نوکر کو پکڑ کر اس کی اچھی طرح مرمت کی گئی تھانے کے داروغہ تک بلالئے گئے۔مگر چور کا پتہ نہ چل سکا۔رانی صاحبہ کا سارا کام

کرنے والا چھوٹا سا نوکروجّو تک ان کے عتاب سے نہ بچ سکا۔ رانی صاحبہ نے بھاری بھرکم پلنگ کا پایہ اس کے نرم ہاتھ پر رکھ دیااور کیم شیم نوکرانی کو حکم دیا کہ وہ پائے پرکھڑی ہوجائے وجّو کی نازک گلابی انگلیاں تک کڑکڑا کر ٹوٹ گئیں مگررانی صاحبہ اپنا بھاری بھرکم وجودلئے بے حس سی کھڑی رہیں اور وجّو بے ہوش ہو گیا۔

شام تک وجّو کو اسپتال پہونچانے والے اعجاز میاں تھے وہ چوری کی تہہ تک پہونچ چکے تھے۔

مگراس چور کا علاج ممکن نہ تھا......

رانی صاحبہ کے بیٹے شہزاد میاں کی صحبت ایسے لوگوں کے ساتھ تھی کہ ان کو روز ہی بڑی بڑی رقموں کی ضرورت پڑتی رہتی۔خرچ کے نام پررانی صاحبہ کی طرف سے تو ان کوآمدنی بندھی تھی پھروہ کرتے کیا۔شہزاد میاں کی سرگرمیاں وہی تھیں جو بغیرپڑھے لکھے آدمیوں کی ہوتی ہیں کوٹھوں پر جانا دنیا کے برے سے برے شوق اپنانا ان کا مشغلہ تھا۔رانی صاحبہ بھی ایک حدتک ان کے شوق پورے کرتی تھیں علاقے کی آمدنی تو دن بدن گھٹ رہی تھی سبھی چھوٹے چھوٹے زمیندار سراٹھائےکھڑے تھے۔

حویلی کے سامنے کھلے میدان میں یوکلپٹس کے پیڑلگائے جارہے تھے کیونکہ پرانے سارے درخت جو راجہ صاحب اور ریاست امیرپورکے رازدارتھے جڑسے اکھڑنے لگے تھے۔شاید اب غریب بیمارمایوس رعایا کو بھی اپنا خیال آنے لگا تھا زندگی کی حقیقتیں ان پرکھلنے لگی تھیں۔اس کی وجہ تعلیم تھی،وہ

تعلیم جو اعجاز میاں ان سب کو دے رہے تھے۔اعجاز میاں بھی اسی ریاست امیرپورکے غریب بیٹے تھے،مولوی فتح محمد جوبچوں کوقران پاک کی تعلیم دیتے تھے ان کے بیٹے نے شہرجاکرتعلیم حاصل کی اور واپس علاقے میں آکرسوئے ہوئے لوگوں کو جگانے کا بیڑہ اٹھایا اورمایوس رعایا کی آنکھوں میں روشنی آگئی۔ان کا اسکول بچوں اور بزرگوں سبھی کے لئے تھا۔مگررانی صاحبہ کو کیسے گوراہ ہوتا لہٰذا حویلی میں اعجاز میاں کی طلبی ہوگئی۔

''ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں......''پردے کے پیچھے سے تلخ اور کراری آواز نے ان کا تصور توڑ دیا۔

''تمہیں کیا حق ہے کہ علاقے کے لوگوں کے لئے اسکول کھولو اور لوگوں کو غلط سلط تعلیم دو......''

اعجاز کے لبوں پرہلکا سا تبسم چمکا۔

''سلام عرض کرتاہوں۔حق تو میرا کوئی نہیں شاید......مگرمجھ پران اپنے لوگوں کے کئی فرض ہیں اور میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں کیونکہ اسی زمین کا بیٹا ہوں یہاں کے لوگوں کی زندگی بنانا چاہتا ہوں''

وہ مودب سراٹھائے کھڑے تھے۔

''تم......تم کیا کسی کی زندگی بناؤگے......''

انھوں نے نخوت سے پان کی پیک اگلدان میں تھوکی۔

''آئندہ اس قسم کے کوئی کام نہ ہوں تم ہمارے ملازموں کو بگاڑ رہے ہو کل سے تم زمینوں کا حساب کتاب دیکھوگے منشی جی اب ضعیف ہو

چکے ہیں۔''گویا انھوں نے بات ختم کردی۔

اعجاز خاموشی سے ان کے بے بنیاد الزامات اور احکامات سنتا رہا اور پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرکر قدم باہر کی طرف بڑھادیے۔

اوراندر رانی صاحبہ کے پاس بیٹھی نورالنساءبیگم کے دل میں یہ سانس ترازو ہوگیا۔یہ پہلاموقع تھاجب انھوں نے اعجازکودیکھا۔

لمبا قدسانولا رنگ مضبوط جسم سیدھے سیاہ بال کشادہ پیشانی اورگہری ذہین آنکھیں۔متبسم ہونٹ اور بے نیاز اندازنوارانساءبیگم کےدل میں اتر گیا۔

ملنے کے راستے ان کی خاص ملازمہ فیروزہ نے طے کئے اور مولوی صاحب کے گھرپروہ جس دشواری سے پہونچی وہ الگ کہانی رہی مگراعجاز اسے دیکھ کربھونچکا رہ گیا......

''آپ......آپ یہاں......''اس کے منہ سے صحیح الفاظ بھی نہیں نکل رہے تھے۔

''کیا آپ ہم کو پڑھائیں گے؟''وہ سراپا التجاء تھی۔

''لیکن رانی صاحبہ......وہ تو......میرامطلب ہے کہ......''

''کیا آپ ہم کو پڑھائیں گے......؟''سوال دہرایا گیا۔

اعجاز کا دل بہت زور سے دھڑکا......آج اسے محسوس ہواکہ ایک معصوم خوبصورت بلکہ بے تحاشہ خوبصورت نورالنساء تو ہمیشہ سے اس کے اندر بسی ہوئی تھی۔وہ دونوں بچپن میں ساتھ ہی کھیل کربڑے ہوئے تھے۔مگروہ اپنے مِشن میں ایسا محوہوگیا تھا کہ سبھی کچھ ذہن سے نکل گیا تھا اور آج

جبکہ اس کا تصوراس کے سامنے تھا تو اس کی کیفیت ہی عجیب تھی اورجب نورالنساء نے اپنا سوال دہرایا تو کوئی چیز چھن سے اس کے اندر ٹوٹ گئی جسے وہ اپنا غرور سمجھتا تھا وہ تو اس گھنے لمبے سنہرے بالوں والی میدوشہاب رنگت والی اورہرنی جیسی آنکھوں والی لڑکی نے ایک دم توڑ دیا۔ وہ تو اک تازہ نیا گلاب اس کے سینے میں دھڑکنے کے لئے رکھ گئی تھی۔جس کی خوشبومیں اعجاز سب کچھ بھول گیا یہاں‌تک کہ اپنی حیثیت بھی۔

محبتوں کی خوشبوؤں کی پاکیزہ راتیں سنہرے جگمگاتے دن انھیں کچھ سوچنے کا موقع بھی کہاں دیتے تھے۔نورکی خاص ملازمہ فیزہ ان کی ملاقات کا انتظام کرتی ''اجّو......''

اس کی لمبی سنہری زلفیں بھیگی بھیگی ہواؤں سے بکھررہی تھیں۔

''ہاں نور......''

اعجازکھلی آنکھوں سے نہ جانے کیا کیا خواب دیکھ رہا تھا۔

''مجھے یہاں سے لے چلو......کہیں بھی......کہیں بھی لےچلومگربس لے چلو......''

''نہیں نوربی بی ......میں آپ کوکہیں نہیں لے جاسکتا کہیں بھی نہیں...... میرے حصے میں امیدبہت کم آئی ہے...... میں بہت غریب ہوں......''

وہ جیسے ہوش میں آ گیا

''میرے پاس آپ کے لائق کچھ نہیں ہے......اورآپ کی بے عزتی ہو...... میں برداشت نہیں کر سکتا۔میرادل تو ہمیشہ ٹوٹتا ہی رہا ہے نوربی بی......''

وہ اپنی ہتھیلیاں دیکھتے ہوئے رنجیدہ ہوگیا۔

''مگر.....مگر میں تو غریب نہیں ہوں''اس نے اک معصوم سی پیشکش کی۔

''نورالنساء بیگم.....آپ میری انا کو للکار رہی ہیں میں آپ سے عزت کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے مجھے محنت کرنی ہوگی اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہوگا کہ آپ کو دنیا کی تمام خوشیاں دے سکوں اور یہ میرا وعدہ ہے کہ.....''اس نے جھک کر.....اسے یقین دلا دیا۔

''مگر میں کیسے رہوں تمہارے بنا.....؟''وہ بے بسی سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

''جیسے اب تک رہی ہیں نورالنساء بیگم.....یہ خواہشوں کے کوڑے تو انسان کو لہولہان کردیتے ہیں۔ ساری عمر اسی کلفت میں گزر جاتی ہے کہ ہمارے پاس یہ نہیں ہے.....اور وہ نہیں ہے اور جب خواہشیں پوری ہونے لگتی ہیں تو انسان ایک بار بھی یہ نہیں سوچتا کہ اس کے پاس کیا کیا ہے.....''وہ تھوڑا سا رکا.....''میں تو مطمئن ہوں کہ میرے پاس آپ ہیں اور آپ کو بھی اس بات سے مطمئن رہنا چاہیئے کہ میں آپ کا ہوں اور رہوں گا..... اعتبار کا رشتہ سب سے خوبصورت رشتہ ہوتا ہیں نورالنساء.....اس رشتے کی قدر کیجئے.....خواہشوں کی انتہا تو کہیں نہیں ہے آپ کو معلوم ہے جو رانی صاحبہ اتنی بڑی ریاست کی مالک ہیں بے سکون ہیں.....انھیں خواہشوں کے دھندھلکوں کے اس پار معصوم زندگیاں نظر ہی نہیں آتیں.....انھیں لگتا ہے ابھی ان کے پاس کم ہے انہیں اور چاہیئے اور.....''وہ رک کر نورالنساء کی طرف مڑا.....

''شہزاد میاں کس راہ پر چل نکلے ہیں اس کی انہیں پرواہ نہیں

ہے......پیسوں کا تقاضہ لے کرروز ہی میرے پاس آفس آجاتے ہیں اور یہ کس کارِخیر میں خرچ ہوتے ہیں میں آپ سے کیا بتاؤں۔آپ کو برا تو لگ رہا ہوں گا بی بی......؟''

''نہیں ابّو......میں توخود اس بات سے نالاں ہوں کاش ہم لوگ غریب ہوتے.....''اس نے سر جھکا لیا......

''پتہ ہے نورالنساء بی بی ہمارا المیہ کیا ہے......''

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ہوئے سرہانہ بناکرسبزے پر لیٹا ہوا تھا۔

''کہ ہماری خواہشوں کے سرخ جنگل میں راستہ کہیں نہیں ہے ہرایک اپنی اپنی آرزوں میں جی رہا ہے اور پھر بھٹکتے بھٹکتے عمرختم ہوجاتی ہے ہم خواہشوں کو پورا کرکے بھی نامراد چلے جاتے ہیں۔ہاتھ تو ہمیشہ خالی ہی رہتے ہیں نا..؟''

مگروہ کیسے کہتی......کہاں ہے میرے پاس کچھ تمہاری نظروں کے طلسم سے زیادہ تمہارے لمس سے زیادہ مجھے تو کچھ نہیں چاہیئے مگر اعجاز تم نے تو مجھے کبھی چھوا بھی نہیں۔

مگرالفاظ ہونٹوں سے ادا کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اور اچانک جیسے حویلی میں طوفان آ گیا......

اعجاز اور نورالنساء کی معصوم محبت رانی صاحبہ سے کب تک چھپی رہتی۔ان کا رشتہ آناً فاناً عظمت اللہ کے عیاش اور بدکردار بیٹے الطاف کے ساتھ قبول کرلیا گیا اور شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

اعجاز زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا رہا اور حویلی میں شادی کی رسمیں شروع کردی گئیں۔نورالنساء بیگم کو نگرانی میں رکھا جانے لگا۔مراثنوں نے گلے پھاڑنے شروع کردیے......پیلا جوڑا پہنے نورالنساء آنسو بہاتی رہی...... جب ان کے ہاتھوں میں مہندی رچائی جارہی تھی تبھی فیرزہ بھاگتی ہوئی آئی اور ان کے پیروں پر سرکھ کر بری طرح رونے لگی......

نورالنساء نے اپنے ہاتھ جھٹک دیے......جانے فیروزہ نے ان سے کیا کہا اور وہ پتھرکی ہوگئیں......

''قاضی صاحب آوت ہیں پردہ کرلیو......''

ناون ڈیوڑھی سے لے کرآنگن تک آواز لگارہی تھی،عورتوں اور لڑکیوں نے رنگ برنگے دوپٹوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا......

قاضی صاحب نے پردے کے اس پاربیٹھی دلہن کا عکس دیکھا تو حیران رہ گئے ان کا تو سربھی جھکانہیں تھا...... وہ سرپربنا دوپٹہ لئے بیٹھی تھیں......

قاضی صاحب نے کاروائی شروع کی۔

''......آپ کوقبول ہے؟''

''نہیں......ہرگزنہیں......'' یہ آوازنہیں تھی پھنکارتھی جوناگن کےمنہ سےنکلتی ہے۔

''جی''؟؟ قاضی صاحب اور گواہ سب کے سب سراسیمہ تھے۔

''ہم نے واضح الفاظ میں انکار کیا ہے قبلہ......''نورالنساء بیگم نے پروقار انداز میں فرمایا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔گویا کہہ رہی ہوں اب آپ تشریف لے جایئے۔

بارات لوٹ گئی......ان ہونی ہو گئی............

سارے لوگ واپس چلے گئے......حویلی ویران ہوگئی۔

بیس برس کا طویل عرصہ کیسے گزرا یہ تو رانی صاحبہ اور نور بی بی ہی جانتی تھیں۔قرض سے لدی ہوئی حویلی کی عزت مٹی میں مل گئی وقت اچانک ہی بگڑ گیا......

نورالنساء بیگم نے اپنے آپ کو رنگوں اور برش میں ڈھال لیا رات سے دن تک بڑی بڑی تصویریں بنانے میں کھوئی رہتیں ان کا خود کا رنگ کب کا اتر گیا تھا ان کو خود نہیں معلوم ہو سکا اورآج کل رانی صاحبہ بیماری اور معذوری کے سبب اپنے کمرے کی ہوکر رہ گئی تھیں نورالنساء بیگم نے ایزل پر برش سے گہرا ہرا رنگ لگایا ہی تھا کہ فیروزہ نے رانی صاحبہ کی طلبی سنائی......

''کہہ دو......ابھی آتے ہیں......''وہ مطمئن انداز میں اپنا کام کرتی رہیں اپنے بالوں کی سفید لٹوں کو سمیٹ کرجب وہ ماں کے بستر کے قریب آئیں تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی حسرت سے اسے تک رہی تھیں۔شاید وہ کچھ کہہ رہی تھیں اور شاید نورالنساء بھی انہیں جواب دے رہی تھیں خاموشی گہری ہوتی چلی جارہی تھی۔تبھی سناٹا ٹوٹ گیا۔ ''امی حضور! آپ نے جوچاہاآپ کو ملا پھربھی آپ کی توقعات ختم نہیں ہوئیں۔ہم نے جو چاہا، مانگا وہ آپ نے میسر نہ ہونے دیا......اعجاز پرانی مسجد کی دیوار میں چنا ہوا آج بھی جوان ہے اورہم بوڑھے ہو گئے۔آپ کی خواہشات توقعات اب تک ختم نہیں ہوئیں......مگر ہماری ہوگئیں...... اسی لئے ہم مطمئن ہیں اور آپ بیقرار ہیں......

خواہشات کا سرخ جنگل آپ کونگل رہا ہے امی حضور......

توقعات نے آپ کو توڑ دیا ہے............

یہی دونوں چیزیں تو ہیں جو ہمیں رنج کے دلدل میں دھکیلتی ہیں۔

اور امی حضور......!وہ پل بھرکو رکیں۔
''ہم نے آپ کو معاف نہیں کیا......''

☆☆☆

چاہت کی چاہ............!

آدھی دنیا کا سفر طے کر چکی تھی وہ......کہاں کہاں چل کر آ رہی تھی وہ......محبت کی تلاش میں چلتی چلی جا رہی تھی شالنی......

پورا آسمان ستاروں سے سجا ہوا تھا......ان کی روشنی سے اس کی راہ منوّر تھی......دھرتی کی گود میں کروڑ و جیو جنتو اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے......ہر کوئی کسی نہ کسی کا منتظر تھا کسی نہ کسی کے لیے جھولی پھیلائے......سب کچھ مل جائے تب بھی لگتا ہے کہ کچھ نہیں ملا......خالی ہاتھ! آرزوؤں تمناؤں کے پورے ہو جانے کے بعد بھی وہی ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں......دوسری نئی تمنا کے لیے...... چتاؤں کی چتا میں جلنے والے لاکھوں کروڑ و جیو جنتو...... بے چین بیاکل......ایک دوسرے سے جھپٹ لینے والے......ایک دوسرے سے چھین لینے والے......ایک دوسرے سے مانگنے والے...... جانوروں کی طرح انسان......سب ایک طرح جیتے ہوئے مرتے ہوئے......

دھرتی پر چھایا ہوا یہ اندھ کار دور کیسے ہو۔؟ روز سورج صبح صبح پوری امید لے کر اندھ

کاردور کرنے اٹھ کھڑا ہوتا ہے مگر سانجھ ہوتے ہی تھک ہار کر مایوس ہو کر واپس اپنی گھپا میں جا بیٹھتا ہے۔

تمہارا کچھ نہیں ہوسکتا......انسانوں......تمہارا کچھ نہیں ہوسکتا میں کہاں تک اپنے آپ کو تمہارے لیے جلاؤں۔بھگوان نے مجھے اجالا کرنے کو بھیجا ہے مگر کیا میں اجالا کر پا رہا ہوں۔وہی کالک وہی پستی......وہی اندھیرا کب تک......؟؟

سورج دیوتا کی کراہ کسی کو سنائی نہیں پڑتی۔

شالنی اسی اندھ کار میں ٹھوکریں کھا رہی ہے......کچھ پتہ نہیں راہ کہاں ختم ہو گی انت کہاں ہے۔محبت کی اک نظر ملے گی......کہاں ہو شیو؟

پیروں میں چھالے پڑنے لگے ہیں......انگوٹھے پر کسی پتھر سے زخم لگ گیا ہے اس سے خون رس رہا ہے مگر وہ ہر بات سے بے خبر چلتی جا رہی ہے......محبتوں کی تلاش میں......کپڑوں پر گرد کی تہیں جم گئی ہیں...... بالوں پر غبار......مٹی چہرے پر ہاتھوں پر......گویا وہ خود ایک مٹی کی مو رت ہو......مٹی میں مل جانے والی...... ہمیشہ اپنی جڑوں سے الگ ہوتی رہنے والی عورت...... جب ماؤں نے بیٹیوں کو چھوڑ کر بیٹوں کو گلے لگا لیا......بیٹیوں کو پرایا کر دیا......بس یہ ریت اسی دن سے شروع ہو گئی......عورت اکیلی پڑ گئی......محبتیں ڈھونڈنے کے لیے آگے بڑھنا پڑتا ہے...... آگے بڑھنے کے لیے اپنی جڑوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔کرب سہنا پڑتا ہے......

وہ ماں باپ ہوں بہن بھائی یا اس گھر کی چوکھٹ...... جہاں اس نے ٹھوکر بھی کھائی ہو گی اسی چوکھٹ پر دیوالی کے دیے بھی جلائے ہونگے وہ چوکھٹ بھی اپنے سے الگ کرنی پڑتی ہے۔

بڑا کرب سہنا پڑتا ہے کیوں سہتی ہے وہ؟ کیوں کرتی ہے ایسا؟ بس محبت پانے کے لیے اور وہ بھی نہ ملے تو ڈھونڈنے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔زمینوں کو چھوڑنا......جڑوں کو کاٹنا جدائیوں

کا درد سہنا......یہی عورت ہے......کوئی مرد کیا جانے کسی عورت کا درد...... بڑا مشکل ہے یہ سب کر پانا......کر جانا......اور پھر بھی جینا......اور دوسری زمین پر مر جانا۔

شالنی نے ٹٹول کر راستہ دیکھا...... تارے کم ہونے لگے تھے...... روشنی کم ہو رہی تھی......اب وہ پتھروں کے درمیان چل رہی تھی بہت ساری مورتیاں آس پاس نرت کر رہی تھیں......   شیو جی چٹان پر براجمان تھے......اس نے تھک کر شیو کے گھٹنوں پر سر ٹیک دیا۔ وہ تھک کر چور چور ہو رہی ہے...... پیاس سے گلا سوکھ چکا ہے......پیر کے زخموں نے بے چین کر رکھا ہے......مگر محبتوں کی تلاش جاری ہے......اور اب شیو جی......جیسے اسی کے منتظر ہیں ایک آس...... محبت کی آس......اک دکھے دل کی امید......اور شیو کے گھٹنوں پر سر دھرتے ہی جیسے سارے دکھ درد آپ ہی آپ کم ہونے لگے......ٹھنڈی ہواؤں نے جسم کو سہلایا......کہ محبت تو مداوا ہے......

شیو کے پتھر سے بنے سفید ٹھنڈے پیروں نے اسے راحت دی......کہ پیار کا احساس تو ہر دکھ کا مرہم ہے...... پیاس کی شدت آپ ہی آپ کم ہو گئی......ایک عجیب سی لذت ایک توانائی کا احساس رگ و پے میں دوڑ گیا...... پور پور شیو کے پیار کے نشے میں ڈوبی پجارن...... پریم کے ساگر میں ڈوب ڈوب گئی ہر دکھ دور ہونے لگا کہ محبت عطا کرتی ہے......نفرت چھین لیتی ہے...... دکھ درد کو جنم دیتی ہے نفرت اور محبت سکھ اور شانتی لاتی ہے...... ہر کوئی پیار چاہتا ہے............اندھکار تب ہی ہوتا ہے جہاں پیار کا انت ہو جائے......ایک دوسرے سے گھڑنا ہونے لگے......ایک کو دوسرے کا وجود کھٹکنے لگے......تب مایا کچھ نہیں کر پاتی......کتنی بھی بھری پڑی ہو...... پیار نہ ہو تو مایا دھن سب بیکار...... چہرے پر نرمی مایا سے نہیں پریم سے آتی ہے......

لہجوں میں خوشبو عطر سے نہیں دل کے درد سے آتی ہے......وہ درد جو برسوں سے چھپا رکھا ہو اور پریمی سے اچانک ملن ہو جائے......

ہے شیو! مجھے اپنے چرنوں میں پڑا رہنے دو گے نا......؟ اس نے دونوں ہاتھوں سے
دھول بھرے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا اور سفید پتھر کے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ کر وہیں بیٹھ گئی سارا دکھ
کرب بھاپ بن کر ہردے سے دور ہو گیا......سب کچھ شانت ہو گیا......اور اندر کا تلاطم کھو گیا......
وہ پرسکون ہو گئی......تھکی تھکائی پجارن شیو کے چرنوں میں پڑی رہی اور پھر شیو جاگ گیے......ان
کے اندر محبتوں کے آنسوؤں نے ہلچل مچا دی تھی ان کے اندر ایک عورت نے جان ڈال دی......وہ
عورت نہ جانے کب سے ان کو کھوج رہی ہے۔ ان کے پیروں میں پڑی بے حال شالنی......حسین تر
ین شالنی......اس کے چہرے کا چاند چمک رہا ہے اس کے گورے ہاتھوں کی نیلی رگیں کپکپا رہی
ہیں......اس کے گھنیرے لمبے بال ایک بار پھر کھل کر ان کے چرنوں میں ڈھیر ہیں۔ چمکتی پیشانی پر
اک غرور......جیت کا غرور......''میں نے شیو کو پا لیا......میں نے محبت کو پا لیا......''
بند آنکھوں میں اک سپنا......ہونٹوں پر آسودہ مسکان......
شیو نے اسے سویکار کر لیا تھا۔ شیو نے ہاتھوں میں شالنی کا چاند چہرہ تھام لیا.......اس کی محبت کو تھام
لیا......اس کی تپسیا کو ارتھ دیا..اور یہی محبت کی جیت ہے......یہی انت ہے......یہی آرنبھ ہے......؟

میلہ

نمائش آ گئی..........علی گڑھ میں رہنے والوں کو کسقدر انتظار ہوتا ہے اس آواز کا..........اس آواز کا سحر میں کئی برسوں سے دیکھ رہی ہوں۔نمائش نہ ہوئی سچّے خواب ہو گئے.......ایک چھوٹا سا شہر گنتی کی بازار.........نام کے لیئے مال بھی ہیں مگر جو لوگ ان نام نہاد مال میں گئے ہیں وہ اصلیت سے واقف ہیں۔

یہاں اگر مسلم یونیورسٹی نہ ہوتی تو یہ شہر خالی ہاتھ ہوتا۔

نمائش کے آجانے سے اس شہر کی رونقیں بڑھ جایا کرتی ہیں.......ہر ایک پر امید نظر آتا ے خاصکر بچّے.......ویسے تو خواہ خاتون خانہ ہوں یا گھر کے بذرگ حضرات سبھی کو نمائش سے دلچسپی ہوتی ہے۔کسی کو وہاں آنے والے میرٹھ کے جھنڈا ہوٹل نظیر ہوٹل کے کھانے کا انتظار ہوتا ہے کوئی حلواہ پراٹھا کھانے کے لیئے بے چین.......کپڑوں اور کشمیری شالوں کا شوق رکھنے والی خواتین کئی کئی چکّر لگاتی نظر آتی ہیں وہاں اور وہیں راجستھانی سوٹ کی دو کانوں پر بھی ویسی ہی بھیڑ نظر آتی ہے۔

کوئی بدایوں کے پیڑے لینے کے لیئے چکر لگا رہا ہے تو کسی کو وہاں کی نان خطائیاں کھینچ لاتی ہیں.......قالین پرانا ہو گیا ہو تو بدلنے کے لیئے نمائش کا انتظار کرتی نظر آتی ہیں تو کوئی وہاں بیڈشیٹ اور لکڑی کے سامان کے لیے چکر لگاتا نظر آتا ہے۔مرادآباد کی جگمگاتی ہوئی دوکانیں تو بس دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں.......آرٹی فیشل جولری کی دوکانیں دور سے چمکتی نظر آتی ہیں۔ اوران دوکانوں پر لڑکیوں اور بچوں کا ہجوم .دور سے نظر آتا ہے۔

بچّے جب ضد پر آتے ہیں تو کوئی تاویل نہیں سنتے آخر مجھے بھی ہونا پڑا،نمائش روانہ ہوئی تو پہلے اے.ٹی.ایم سے اچھّی خاصی رقم بھی نکالنا پڑی۔اب پہلے والا زمانہ تو رہا نہیں کہ پچاس روپیئے لے کر جاؤ اور دنیا بھر کا سامان خرید لاؤ۔

کچھ یاد کر کے آپ ہی مسکراہٹ آ گئی۔نمائش کی بھیڑ بھاڑ میں بھی یادوں نے پیچھا نہیں چھوڑا.......ذہن کہیں پیچھے چلا جا رہا تھا.......اور پیچھے.......اور پیچھے.......

اک چھوٹا سا گاؤں جہاں گومتی ندی بہتی ہے.......وہیں کنارے ایک پہاڑی ہے جس پر ستھّن کا میلہ لگا کرتا تھا.......ستھّن اس گاؤں کا نام ہے۔کیا بتائیں کیسی کیسی یادیں جڑی ہیں اس میلے سے.......جگمگاتی ہوئی روشنیوں کی یادیں.......کھلکھلاتی ہوئے چہروں کی یادیں میٹھی میٹھی خوشبوؤں کی یادیں....... بھاگتے دوڑتے قدموں کی.......مزار پر جلتی ہوئی اگربتّی کی خوشبوؤں کی.......قوالی کی تان میں ایک مسحور کن کیفیت کی یادیں.......ستھن کی اس پہاڑی پر ایک مزار ہے اسی مزار پر ہر برس عرس ہوتا ہے اور زبردست میلہ لگتا ہے.......تمام دوکانیں بھی اونچی پہاڑیوں پر لگتی ہیں.......ان پر چڑھنے اترنے کا اپنا ایک مزا ہے.......اور تب زندگی اتنی تھکی ہوئی نہیں تھی نا.......؟

کیسے مزے سے اڑتے پھرتے تھے۔

اپنے گھر میں سب سے زیادہ مجھے میلے کا انتظار رہتا تھا۔اور جب میلہ لگ جاتا تو پھر

جانے کی ضدیں شروع ہو جاتیں...... ابّی سمجھاتے بھی ''ارے بٹیا ٹھیک طرح سے لگ تو جائے...... پھر بھیج دیں ......'' مگر مجھے تو یہیں ڈر رہتا کہ کہیں میرے بغیر گئے میلہ چلا نہ جائے......آخر وہ دن بھی آجاتا جب بابا ہمیں میلہ لے کر جاتے......ہمیں خرچ کرنے کے لیئے پانچ روپیے ملتے تھے۔صرف پانچ روپے......اور ان سے ہم ڈھیروں چیزیں خرید لیتے تھے کھانے پینے کی چیزیں لینا ہمیں سختی سے منع تھیں۔

ابی کا کہنا تھا جو کھانا ہو ہمیں بتا دو ہم معیاری دوکان سے منگوا دینگے۔میلہ کی دھول میں بکتی چیزیں صحت کے لیئے سخت مضر تھیں۔

ہم کھلونے لیتے رنگ برنگے کاغذ کے پھول...... چکریاں پلاسٹک کے ناشتہ دان ننھے چائے کے برتن۔چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی پیالیاں جن پر پھول بنے ہوتے۔مختلف رنگوں کے کلپ......ہم سب خرید لیتے مگر پیسے ختم نہیں ہوتے تھے۔ بابا مٹھائی کی دوکان پر رک جاتے......

''کھاؤ گی بٹیا؟''

''نہیں ابّی نے منع کیا ہے۔''میں دوسری طرف دیکھنے لگتی''

''ارے انھیں کون بتائے گا؟ تم کھالو جو جی چاہے...... پیسے ہیں ہمارے پاس......'' وہ سخی ہوتے۔مگر دل نہ مانتا......بس غصّہ اس بات پر آتا کہ یہ مٹھائیوں کی دوکانین اتنی سجا کر کیوں رکھتے ہیں؟ مزار پر قوّالیاں سننے کھڑی ہو جاتی......

''سہانی رات تھی اور پر سکوں زمانہ تھا......اثر میں ڈوبا ہوا جذب عاشقانہ تھا......ہوس تھی دید کی معراج کا بہانہ تھا......سرِ لا مکاں سے طلب ہوئی،سوئے منتہا وہ چلے نبی......''

ابتک یہ مصرعے بھول نہیں سکی ہوں......خیالوں کی دنیا سے باہر نکلی بچّے سوفٹی کی دوکان پر تھے۔ میرے ہاتھوں میں بھی ایک کون تھا......کچھ دیر دیکھتی رہی......پھر اسے سامنے کھڑے ایک لڑے کو تھما دیا جو حسرت سے دوکان دیکھ رہا تھا۔

اوہ چورن تو رہ گیا......بچّوں کو وہیں مصروف چھوڑ کر میں واپس فوّارے والی لائین کی طرف بھاگی۔ جہاں چورن کی کئی دوکانیں تھیں کیونکہ سال بھر یہ کہیں نہیں ملتا تھا۔

آلو بخارہ اور انار دانے کا چورن لے کر واپسی کے لیئے چل پڑی اور پرس میں پیسے دیکھنے چاہے تو سارے پیسے ختم......ایک کونے میں پانچ روپیے کا سکہ جھانک رہا تھا۔ مطلب میں آرام سے ستّھن کے میلہ جا سکتی ہوں؟ مجھے ہنسی آ گئی اور چال میں بچپن کی مستی اور بے فکری بھر گئی۔

☆☆☆

عیدسعید

عید کی ساری شاپنگ بستر پر بکھری پڑی تھی، عالیہ نے ایک نظر سامنے رکھے ہوئے بیگس پر ڈالی ابھی تو بہت سارا سامان بیگ میں ہی پڑا تھا، ڈیکوریشن، کشن کور، کٹ کور، کٹ گلاس کا سامان.......اس کے کھلنے کی تو ابھی باری ہی نہیں آئی تھی۔

وحید کے آنے میں بس اب دو دن ہی باقی تھے وہ چاہتی تھی کہ اس کے آنے سے پہلے سارا گھر سج جائے، اک نئی تازگی اک نیا احساس جو وحید کو اس کے پاس زیادہ سے زیادہ دن گزارنے پر مجبور کر دے۔

نیئے ڈیزاین والے منہگے بوتیک اس کے لیئے تو عالیہ سارا بازار خرید لینا چاہتی تھی۔ الماری میں سے خریدے ہوئے کپڑے بھرے تھے مگر پھر بھی وہ ڈھیر سارے نیئے خرید لائی تھی۔ اسٹائیلش جوتے، برانڈیڈ کمپنیوں سے میک آپ کا سامان اور نہ جانے کیا کیا الم غلّم.......اور ابھی بھی دل نہیں بھرا تھا.......

دروازے کی گھنٹی بجی تو وہ چونک گئی۔

''وہ مدرسے والے آئے ہیں چندہ لینے''شبّو نے روبٹّے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بتایا۔''ارے بھئی کہہ دو گھر پر کوئی نہیں ہے بعد میں آئیں''اس نے جھنجھلا کر کشن دوسری طرف پھینکا اور ڈریسنگ ٹیبل کا سامان سیٹ کرنے لگی.......برسات کی شامیں ویسے ہی اداس ہوتی ہیں۔ تیز بارش سے جل تھل ہو رہا تھا۔ایک سیلی سی ٹھنڈک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔اس نے باہر گاڑی نکالی ہی تھی کہ سامنے گیٹ کے پاس بیٹھے ہوئے علیم الدین پر نظر گئی۔وہ بری طرح کھانس رہے تھے۔عالیہ نے ایک نظر ان پر ڈالی اور گاڑی تیزی سے باہر لے گئی،علیم الدین اسے دیکھ کر الرٹ ہو گئے تھے۔

کافی سامان لے کر جب وہ واپس آئی تو رات کی سیاہی پھیلنے لگی تھی۔شبّو لیونگ روم میں کارپٹ پر بیٹھی اونگ رہی تھی۔اسے دیکھتے ہی ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی،'بی بی جی!ابّا طبیعت بہت خراب ہے'اس کی آواز میں آنسو بول رہے تھے۔''ہاں.......تو کسی ڈاکٹر کو دکھا لینا کل جا کر....... یہاں کیا ہوسکتا ہے''مگر بی بی جی....... پیسے.......''اس معصوم کو تو مانگنے کا بھی سلیقہ نہ تھا.......بس بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلا دیے۔عالیہ نے چند نوٹ اس کے ہاتھوں پر رکھے اور اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔اف.......کیا مصیبت ہے ہر وقت مانگنے کی عادت پڑ گئی ہے ان لوگوں کو'اس نے کوفت سے سر جھٹکا اور اندر جا کر اپنا لایا ہوا سامان سیٹ کرنے بیٹھ گئی۔

صبح صبح وحید کے آ جانے سے گھر میں رونق سی ہوگئی۔بچّوں نے پورے گھر میں ادھم مچایا ہوا تھا۔وہ خود بھی بچوں کے ساتھ بچّہ بن بیٹھا تھا.......ایک خوشگوار سی چہل پہل ہر طرف نظر آ رہی تھی۔

شبو بار بار چائے بنا رہی تھی حلانکہ خود اس کا روزہ تھا مگر مالک لوگوں کو جو بھی چاہیئے وہ

اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔

ساتھ ہی ساتھ وہ صبح کے لیئے شیر خرمہ بریانی کا مصالحہ بھی بناتی جارہی تھی۔اس کی آنکھیں متوّرم اور رنگ پیلا پڑ رہا تھا۔لیکن کسی کے پاس اس کی اداسی کا سبب جاننے کے لیئے وقت نہیں تھا۔شام ہوتے ہوتے وحید کے دوستوں سے لیونگ روم بھر چکا تھا۔علیم الدین گیٹ پر نظر نہیں آرہا تھا۔اندر چاندرات کی خوشی میں عبادتوں کے بجائے جام چھلک رہے تھے۔

ہر ایک اپنے آپ میں مگن تھا۔بلند و بانگ قہقہوں سے سارا گھر گونج رہا تھا۔شبّو نے کئی بار آکر بات کرنے کی کوشش کی مگر مایوس ہوکر اپنے کواٹر میں چلی گئی۔ایک بار عالیہ نے وحید سے ہلکی آواز میں بتایا کہ علیم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ا یکبار اسے دیکھ لیں مگر وہ اپنے ایک پرانے دوست سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے''ارے ہزار دو ہزار دے دو جا کر کسی کو دکھالے.......وقت کس کے پاس ہے جانم''اور بے ہنگم ہنسی ہنستے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

وحید چودھری اپنے گاؤں سے شہر پڑھنے کے لیئے آئے تھے اسی وقت سے علیم ان کی خدمت پر معمور تھے جب وحید نے شادی کی تو گھر میں ایک عورت کام کے لیئے چاہیئے تھی اس لیئے۔اس نے اپنی بیوی اور بچی کو بھی یہیں بلا لیا تھا۔بیوی کے انتقال کے بعد وہ اور بھی اکیلا ہو گیا۔شبّو اس کی زندگی کا سہارا تھی اور اس کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا۔بس بیٹی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بن گئے۔وحید چودھری اپنی تعلیم ختم کر کے ملک سے باہر چلے گئے تو عالیہ کے لیئے وقت گزارنا مشکل ہوگیا ایسے میں شبّو نے ان کا بہت ساتھ دیا۔

مگر اس کا ساتھ دینے والا اس وقت کوئی نہ تھا۔وہ اپنے باپ کو قطرہ قطرہ مرتے دیکھ رہی تھی۔اور ادھر عید کا جشن چل رہا تھا۔عید کی صبح آسمان بادلوں سے بھرا تھا۔پھر زور شور سے بارش شروع ہوگئی۔اس کے باوجود ہر طرف عید کی نماز کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔لوگ مجمع کی

صورت میں مسجد کا رخ کر رہے تھے۔خطبہ شروع ہو چکا تھا۔

''رمضان کے اس مبارک مہینے میں ہر رات آسمان سے ندا آتی ہے کہ خیر چاہنے والے خوش ہو جا اور برائی کے طالب رک جا اور اپنے نفس کو گناہوں سے باز رکھ، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں حضورؐ پاک کے طریقے پر چلنے کی توفیق عطا فرما، دعید کی خوشیاں منانے سے پہلے ہم اپنے آس پاس دیکھ لیں کوئی غریب بے سہارا تو نہیں....... پڑوسی بھوکا تو نہیں.......صدقہ فطرہ اور زکواۃ اسی لیئے عائد کی گئی کہ کوئی مسلمان بھائی کم از کم عید کے دن رنج کی حالت میں نہ رہے۔''
بارش نے زور پکڑ لیا تھا۔علیم الدین کی سفید جالی دار ٹوپی جو شبّو نے کل دھو کر ڈالی تھی الگنی سے اڑ کر کیچڑ میں جا پڑی تھی۔

علیم الدین نے جب آخری ہچکی لی تو نماز شروع ہو چکی تھی۔ شبّو سرونٹ کواٹر ے دروازے کو تھامے سسکیاں لے رہی تھی۔ مالکوں کو نیند سے جگانے کی ہمّت نہیں تھی اسمیں۔ وحید چودھری کے گھر والے سکون کی نیند سو رہے تھے۔ دوپہر کو اٹھ کر تیّار ہی تو ہونا تھا.......عید کے لیئے۔

یہ رابطے دل کے۔۔۔

صاحبزادی لوٹ کر گھر آ گئی ہیں'' چچا نے ہاتھ دھو کر کھانے لے لئے تخت پر بیٹھتے''
ہوئی اطلاعً زور سے کہا۔

روٹی کی ڈلیا کھولتے ہوئے چچی جان کا ہاتھ دم بھر کو کانپ گیا۔

حد ہوتی ہے بے غیرتی کی۔۔۔۔انھ۔۔'' چچا نے سالن کا ڈونگا اپنی طرف کھسکایا۔
اور'' پلیٹ سیدھی کی۔

آپ کو اسقدر غصّہ کیوں ہے۔۔۔'' چچی جان نے'' آپکو'' پر زور دیتے ہوئے ان کی
جانب، نگاہ کی۔

انھوں نے قہر برساتی نظروں سے چچی جان کو دیکھا، ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور
آنکھوں میں بے انتہا نفرت کا احساس تھا۔

کیوں ہے۔۔؟ آپ کو نہیں معلوم رضیہ بیگم غصّہ کیوں ہے۔۔۔؟ غیرت دار آدمی

ہوں بے ''غیرت نہیں ہوں اور لوگوں کی طرح۔۔'' انھوں نے چمچہ دسترخوان پر پٹخا۔

باپ دادا کی پگڑی اچھال کر وہ بے غیرت۔۔اور باقی لوگ صبر کئے بیٹھے ہیں''

''میری بیٹی کرتی ایسا۔۔یہیں اسی جگہ زمین میں دفن نہ کر دیتا تب کہتیں۔۔اللہ نہ کرے۔۔'' چچی جان نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔''

اور تم پر تو انہی لوگوں کا رنگ چڑھا ہے غیرت اور عزّت جیسے الفاظ تم کیا سمجھو' گی۔۔'' حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اپنی بات میں اضافہ کیا۔

''اور خبر دار جو یہاں سے کوئی ملنے گیا۔۔یا وہ اس چوکھٹ پر چڑھی۔۔۔''

دکھ سا دکھ تھا ان کو۔۔؟ ننھی سی جان ان کے ہاتھوں میں پل کر تو جوان ہوئی تھی وہ۔۔۔ پرانے زمینداروں کی طرح ظہیر علی خاں اور فیصل علی خان میں مقدمہ بازی تو چلتی رہتی تھی۔زمین جائیداد کے قصّے کس جاگیردار خاندان میں نہیں ہوتے؟ بڑی بڑی باتیں ہو جاتیں، قتل تک ہو جایا کرتے تھے۔ان دونوں بھائیوں میں بھی برسوں سے مقدمے چل رہے تھے۔ آگ میں تیل ڈالنے کا کام گاؤں والے بہت مہارت سے کرتے اور فایئدہ اٹھاتے۔باتیں ادھر کی ادھر کرنے میں دیگر لوگوں کا بڑا ہاتھ تھا اور باتیں بھی اس طرح پیش کی جاتیں کہ دونوں بھائی کھول کر رہ جاتے مگر وضع داری کا یہ عالم تھا کہ جب مقدمے کی تاریخ پڑتی تو ایک دوسرے کو کہلوا بھیجتے کہ ''ہم نے گاڑی نکلوالی ہے ساتھ ہی چا لیئے گا۔۔'' اور دونوں بھائی ساتھ ساتھ بیٹھ کر دنیا بھر کی سیاست پر باتیں کرتے کچہری پہونچتے۔۔بحث ہوتی وہ بھی کرتے۔۔پھر تاریخ پڑ جاتی تو دونوں ایک ساتھ واپس بھی ای گاڑی میں آجاتے۔

آم کی فصل میں ایک دوسرے کے گھر آموں کی دعوت ہوتی۔اہتمام سے نزریں ہوتیں،تو ایک دوسرے کو بلایا جاتا۔عقیدت سے کھانا جاتا۔کسی بچّے کی تقریب ہوتی تب بھی سب

ملکر مناتے۔عید کی نماز دونوں بھائی ساتھ ہی ادا کرتے اور سب بچّوں کو عید دیکر ہی فیصل علی خان اپنے گھر جاتے، وہ اپنے بڑے بھائی کی بے حد عزّت کرتے تھے اور بچّوں سے بے پناہ محبت بھی ۔۔۔جب سے بڑے بھائی کی بیوی کا انتقال ہوا تب سے چچی جان کا زیادہ تر وقت ان بچّوں کی دیکھ بھال میں گزرنے لگا۔

خاص کر ارم تو ان کی لاڈلی تھی۔

دکھ سا دکھ تھا انکو؟؟

ننھی سی ارم بن ماں کی بچی، جب ان کی اپنی بیٹیاں نہائی دھوئی صاف ستھری فراکیں پہنے اڑتی پھرتیں تو وہ آجاتی۔میلی کچیلی فراک پیروں میں دھول سر میں جوئیں۔۔۔وہ اس کا سر صاف کرتیں نہلاتیں نئی فراک پہنا کر بنا سنوا دیتیں۔

اس کی حالت کی کمی تھی وہاں؟ سوا ایک عورت کے۔

اس کی چپل اتروا کے اسے سینے بیٹھ جاتیں۔

ارے کیا کر رہی ہو؟ دوسری چپل پہنا دو اسکو۔'' وہ اخبار ہٹا کر محبت سے اسے تکتے''۔۔۔

''رہنے دیجیے۔۔بھائی جان کو اچھا لگے گا۔میں ابھی ٹھیک کیئے دیتی ہوں۔''

ایسا نہیں تھا کہ وہاں کسی چیز کی کمی تھی۔کپڑے بکسوں میں بھرے تھے جوتے چپل بے شمار۔۔کوئی معاشی مسئلہ نہیں تھا۔مسئلہ تو بس اتنا تھا کہ ظہیر علی خان اور طرح کے آدمی تھے وہ بچّوں کو دیکھ نہیں سکتے تھے سب نوکروں کے ہاتھ میں تھا۔

جب ارم کے کان چھدے اور خیال نہ ہونے کی وجہ سے پک گئے وہ انہیں کے پاس دوڑی آئی۔

''بہت درد ہو رہا ہے چچی جان۔۔''

او چچی جان نے بزرگوں کا بتایا ہوا نسخہ آزمایا۔

اس وقت ارسل سب سے چھوٹا بیٹا ہوا تھا۔انھوں نے جھٹ ارم گود میں لے کر لٹا لیا اوراس کے کانوں کی لوؤں پر دودھ کی دھاریں دالیں، وہ سکون سے ان کی گود میں ہی سو گئی اور وہ کئی گھنٹوں تک گھٹنا ہلائے بغیر بیٹھی رہیں۔

صبح کی اوس جمع کر کے کانوں پر لگائی۔۔ہومیوپیتھی کی دوائیں کھلائیں، جب تک اس کے کان ٹھیک نہیں ہوئے بے قرار ہیں۔

''وہاں کسی کو فکر نہیں تو تم کیوں دبلی ہوئی جاتی ہو فکریں کر کر کے؟''

سبھی بچّے ہیں وہاں بھائیجان کے پاس وقت کہاں۔۔جو یہ سب دیکھیں۔۔کیا ہوا جو میں''۔۔۔ بن ماؤں کی بچی ہے۔

بولتے بولتے ان کی آنکھیں آنسوں سے بھر جاتیں سر جھک جاتا۔۔۔

''ٹھیک ہے۔۔کرو خدمتیں۔۔کوئی ماننے والا نہیں ہے وہاں تمہاری بے لوث محبت کو''

میں کسی کو منوانے کے لیئے نہیں کوتی یہ تو دل کے رابطے ہیں۔۔''انکی آواز دھیمی''

کنگھی کر کے چوٹی گوندھ دیتیں وہ صاف ستھری ہو کر چمک اٹھتی۔۔۔آنگن میں لگے بیلے اور موگرے کے پھولوں کو گوندھ کر گجرے بنا لاتی۔۔کبھی ان کے بالوں میں اور کبھی ہاتھوں میں پہنا دیتی اور وہ اس خوشبو سے مسحور بیٹھی رہتیں۔

وقت گزرتا رہا۔عامر کی تعلیم اب ختم ہو گئی تھی اس نے ایک فلیٹ شہر میں لے لیا تھا اور نوکری کی تگ ودو میں مشغول تھا۔

چچی جان کی نظر کے زاویئے بدل گئے تھے وہ ارم کو اپنی بہو بنانے کے خواب دیکھنے لگی

تھیں۔ وہ عامر کا ہر انداز پہچانتی تھیں کہ ارم دیکھ کر اس کی انکھوں میں جو معصوم سی چمک در آتی اس کا کیا مطلب ہے وہ اس کے انداز خوب پہچانتی تھیں۔ اپنے بچّوں میں سب سے زیادہ پیارا تھا انھیں۔۔

وہ بس عامر کی ملازمت کے انتظار میں تھیں۔ وہ گاؤں میں نہیں رہنا چاہتا تھا، حالانکہ اب گاؤں پہلے جیسا تاریک نہ رہا تھا۔ ہتھیلیوں سے چراغ، انگلیوں سے لالٹینیں نکل کر دیواروں پر بلب اور سی۔ایف۔ایل بنکر اجالے بکھیر رہے تھے۔ ہاتھوں کے بنے رنگ برنگے پنکھے اب سیلنگ فین بن گئے تھے، گھڑونچی کی جگہ اب واٹر کولر اور ایکوا گارڈ نے لے لی تھی بڑی خوبصورت تبدیلی تھی مگر عامر جانتا تھا کہ حالات بدل گئے ہیں اب ملازمت ے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

اور جب انھیں کی شادی کی خبر ملی تو وہ دل پر ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔ بڑی عجیب نا قابل۔ اعتبار بات تھی کہ اس نے خود کسی کو پسند کر لیا اور بھائیوں بہنوں کی مرضی کے خلاف نکاح ہو گیا۔

عامر آکر خاموشی سے ان کی ماممتا بھری گود میں لیٹ گیا۔ وہ اپنی کانپتی انگلیوں سے اس کی پلکوں سے دکھ چنتی رہیں۔ وہ اس کے غم سے خوب واقف تھیں۔

اس کے لب خاموش تھے اور انکھیں نوحہ کناں رکھا اور اذیت کے یہ دو سال بڑی مشکل سے کٹے بیان کرنا بیحد مشکل تھا اور وہ موگرے، بیلے کے پیڑوں کو پانی دیے جاتیں۔۔۔ بھائی جان کا تو برا حال ہو گیا۔۔۔'' وہ پھر حال میں آ گئیں۔۔ برا حال؟؟؟ خود بلایا ہے انھوں نے ۔۔۔دعوت کی ہے داماد کی۔۔ جا کے دیکھو کس قدر آؤ'' بھگت ہو رہی ہے۔ بیٹی داماد کی۔۔ غصہ میں پانی کا گلاس پٹخا اور چیخ کر بولے۔''خود گئے تھے بلانے اس بدذات و بے حیا کو۔۔''چلیئے ٹھیک ہے اب۔۔۔شادی ہونی تھی ہو گئی'' چچی جان صلح جو تھیں۔''

ایسے ہوتی ہیں شادیاں؟؟؟ بیٹی صاحبہ نے پسند کیا اور آپ نے جا کر نکاح کروا دیا؟؟'' نہ کسی سے رائے نہ مشورہ ۔۔ خود ان کے صاحب زادے خلاف ہیں۔۔ گھر نہیں آئے۔۔۔اچھا ہے پھوٹ پڑے باپ بیٹے میں'' وہ طنزیہ مسکرائے چچی جان خاموش بیٹھی رضائی کی گوٹ پر انگلیاں پھیرا کیں۔ عامر کو لڑ کیا ذں دکھا دکھا کر تھک ئیں مگر اس کی ایک نا۔۔ ہاں میں نہیں بدلی۔۔۔ وہ سب جانتی تھیں مجبور تھیں۔۔۔ افسردہ تھیں۔ شام ہو رہی تھی ڈیوڑھی میں اندھیرا سا تھا۔۔۔تب انھوں نے دو برس کے بعد اسے دیکھا۔۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی ہلکا نیلا سوٹ ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں ہلکے ہلکے لرز رہی تھیں۔ چچی جان نے گھبرا کر اندر کی طرف نظر کی۔ وہ شاید مطالعے میں مشغول تھے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا لائٹ جل رہی تھی۔

دالان میں عامر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سلام کر کے خاموش کھڑی رہی۔انھوں نے بغور اسے دیکھا بہت کمزور نظر آئی اپنے آنسو چھپا کر اسے گلے لگا لیا۔

پھر اسے وہیں چھوڑ کر جلدی سے باورچی خانے میں گئیں۔ رواج کے مطابق کچھ چیزیں لے کر آئیں اس کا انچل تھام کر ارد کی دال، چاول۔ایک بھیلی گڑ اور ایک سو کا نوٹ اس کے پلّو میں ڈالا اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر بہت تکلیف سے بولیں۔۔

''جیتی رہو خوش رہو۔۔۔مگر اب یہاں کبھی مت آنا۔۔''

اور دروازہ بند کر دیا۔ واپس آ کر آنگن میں بیٹھ گئیں اور کھرپی سے بیلے اور موگرے کے پیڑوں کو بیدردی سے کاٹنے لگیں۔ تب عامر دالان سے ننگے پاؤں اٹھ کر آیا اور انھیں اپنی باہوں میں چھپا لیا۔دروازے کی زنجیر ایک بار پھر کھڑکی۔دونوں نے ایک ساتھ سر اٹھا کر دیکھا ۔چچا باہر سے آ رہے تھے انکی باہوں کے گھیرے میں لپٹی سسکتی ماہ گل کو دیکھ کر وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

چچا ہنستے ہوئے بولے

لو دیکھو باہر ہی سے چلی جا رہی تھی میں نہ دیکھ لیتا تو تم سے ملے بغیر ہی چلی جاتی ۔انکی شفقت بھری آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

لا و بھئی کچھ چائے ناشتہ کر واو ہماری بیٹی اتنے دنوں بعد گھر آئی ہے ۔وہ اسے لیئے ہوئے برامدے میں پڑے تخت پر بیٹھ گئے۔

چچی جان کو حواس میں آنے میں کافی دیر لگی۔

ختم شد

☆☆☆

کفارہ

وہ غصہ میں بڑبڑاتی ہوئی اپنا سامان سمیٹتی اور سوٹ کیس میں بھرتی رہی ''کون رہ سکتا ہے ایسے جانور نماانسان کے ساتھ......دوسروں کے جذبوں کا کوئی خیال نہیں......بس ہمیشہ اپنی منواتا ہے یہ شخص......بدمزاجی کی انتہا ہوگئی......بات کرنا تو جیسے جناب کی شان کے خلاف ہے'' دروازے کی گھنٹی زور زور سے بج رہی تھی مگراس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی......''رشتوں کا ذرا بھی احترام نہیں اس شخص کے دل میں......ایسا نہ ہوتا تو......''اس نے سوٹ کیس بند کیا اور ایک طرف ڈال کر جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

''کون ہے؟''

اس نے جھنجھلاکر چہرے پر بکھرے بالوں کو پیچھے کیا۔

''کیا یہ احسن درّانی صاحب کا گھر ہے؟''

ایک نازک سی ۱۷۔۱۸ سال کی لڑکی ایک چھوٹا سا بیگ کاندھوں پر لیے کھڑی تھی۔اس کے چہرے پر سفر کی گرد اورعجب طرح کی پریشانی تھی۔وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی پھرجیسے ہوش میں آ گئی......

''ہاں ہاں آیئے یہی گھر ہے۔''اس نے دروازہ پوراکھول دیا

''آپ......؟'' اس نے جھجھک کرکچھ پوچھنا چاہا......مگر اس نے غصے سے ہاتھ ہلایا ''نہیں نہیں میں مسز درّانی نہیں ہوں۔سمجھیں آپ......اور آپ کون ہیں؟ اچھا ٹھہریئے احسن کو بلاتی ہوں' اس نے چہرہ اندر کی طرف کرکے آواز دی......''باہر آؤ......کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔''

''کون ہے بھئی......کیا مصیبت ہے......کوئی بھی منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔''وہ جھنجھلاتا ہوا کمرے سے نکلا۔

''جی کہئے کیا کام ہے؟'' وہ اپنے پرانے اکھڑپن سے بولا......

لڑکی اس کا چہرہ دیکھتی رہی......

''بولئے نا کون ہیں آپ کیا کام ہے میں ہوں احسن درانی......''

''میں رابعہ درانی ہوں۔''اس نے احسن کی طرف دیکھتے دیکھتے کہا......

''تو پھر......؟'' وہ الجھا کھڑا رہا۔

''میں حیدرآباد سے آئی ہوں......'' احسن درانی کی سوالیہ نظریں پھربھی اس کے چہرے پرجمی رہیں۔

''میں تحریم درانی کی بیٹی رابعہ ہوں''احسن کے ذہن میں ایک جھماکا

سا ہوا......

''کیا کہا ......تحریم......؟''

''ہاں بیٹی ہوں میں آپ کی'' اس نے بیگ اپنے کاندھے پر بدلا۔ برابر میں کھڑی شہنا نے سوٹ کیس ہاتھ سے رکھ دیا اور چونک کر دونوں کو دیکھنے لگی۔

''آؤ اندرآؤ......''احسن اندر کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ '' کیسے آنا ہوا......؟''

''ارے عجیب ہوتم......آؤ رابعہ'' اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام کر صوفے پر بٹھا دیا اور پانی لینے اندرچلی گئی جب وہ پانی کولڈڈرنکس اورکچھ بسکٹ لے کر آئی تو رابعہ آنکھوں میں آنسو لئے دھیرے دھیرے بتا رہی تھی۔

''ممی اب نہیں ہیں......'' اس نے سسکی لی۔

''جب تک ممی زندہ رہیں کسی نہ کسی طرح گھرچلاتی رہیں مگراب......اب میرے پاس بالکل پیسے نہیں ہیں...... اور میں......بہت مجبورہوکر آپ کے پاس بڑی مشکل سے حیدرآباد سے یہاں تک آئی ہوں اور......''اس کی آواز آنسوؤں میں گھٹ رہی تھی۔

احسن درانی خاموشی سے اس کا چہرہ تکتے رہے۔شایدوہ اس کے معصوم چہرے پر اپنی برسوں کی بچھڑی بیوی کا چہرہ دیکھ رہے تھے،اپنی تحریم کا چہرہ......جسے وہ کسی معمولی سی بات پرلڑجھگڑ کر چھوڑ آئے تھے تب رابعہ دو سال کی تھی اور اتنے برسوں میں انہوں نے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی

کہ وہ گھربدل کرکہاں چلی گئی اور آج......کیا ایسے رشتے بھی مرجاتے ہیں؟ پہلے اس رشتے کو اتنے پیار سے نبھایا دل سے چاہا جذباتی آبیاری کی اپنے طورپر ہرطرح خیال رکھا......اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں اس رشتے پرقربان کردیں۔مگرپھرچھوڑکر برسوں بتا دیئے یہ نہ سوچا اس کا کیا ہوگا۔جیسے کوئی تناور درخت جڑ سے اکھڑجائے......جیسے کوئی دل کا حصہ مرجائے......کیا لوگوں کو خودپر اعتبار نہیں ہوتا......لوگ اپنے بنائے رشتوں پرقائم نہیں رہ سکتے تو رشتے بناتے ہی کیوں ہیں۔تحریم کی موت کی خبر ان کے لئے بہت بڑا سانحہ تھی اور اب یہ رابعہ......وہ گرنے کے انداز سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

چند دن رابعہ کے ساتھ گزار کر احسن کو یہ احساس ہوا کہ جیسے وہ تحریم کے ساتھ ہی رہ رہے ہوں۔وہی ضد وہی خودداری وہی بے جا انا جو تحریم کی ذات کا اک حصہ تھی اور جو ہمیشہ ان دونوں کے جھگڑے کا سبب بنتی رہی......احسن اپنی بیٹی کے ساتھ محبت اور شفقت کا جو سلوک کرنا چاہتے تھے وہ کرنہیں پا رہے تھے یا شاید وہ جھجک رہے تھے اور رابعہ بھی انہیں موقعہ نہیں دے رہی تھی......مگرشہنا ان کی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتی رہتی......رابعہ صبح صبح اخبار لئے بیٹھی تھی جب شہنا اس کے پاس آئی......

''اچھا بھئی میں تو اپنے پارلر جارہی ہوں شام تک آؤں گی تم دن بھر کیا کروگی'' اس نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا۔

''کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں؟ اس نے جھک کر چپل پہنتے ہوئے پوچھا......اس نے چھوٹے سے اسکرٹ پر ٹائٹ شرٹ پہنا ہوا

تھا۔

''ہاں ہاں ضرور.....مگر میں شام کوواپس آتی ہوں۔''

''نہیں دراصل مجھے......ایک آفس میں کچھ کام ہے۔'' اس نے رکتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں تم چلو تیار ہو جاؤ.....وہ یہ کہتی ہوئی لاؤنج سے نکل گئی رابعہ جب تیار ہو کر آئی تو احسن ناشتہ کر رہے تھے۔

''کہاں کی تیاری ہے''......احسن نے سلائس پر جام لگاتے ہوئے چائے کا کپ اپنی طرف رکھا۔

''سر......وہ......میں جاب کرناچاہتی ہوں۔''اس نے اتنے دنوں میں ایک باربھی انہیںڈیڈی کہہ کرنہیں پکارا تھا۔ انھوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ''یہ پیپرمیں ایک ایڈہے......ماڈلنگ کا''......اس نے پیپراحسن کی طرف بڑھایا۔

''تم......تم ماڈلنگ کروگی'' احسن کا موڈخراب ہوگیا۔

''کیوں اس میں کیا برائی ہے ہزاروں لڑکیاں کرتی ہیں۔'' اس نے آرام سے ناشتہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں ہاں ہزاروں لڑکیاں کرتی ہیں مگروہ کیا ہوتی ہیں ان کے ساتھ کیا کیا.....'' احسن کو غصہ کی زیادتی کی وجہ سے کھانسی آگئی......شہنا نے آگے بڑھ کرانہیں پانی کا گلاس تھمایا اور ان کی پیٹھ سہلانے لگی''ارے کچھ نہیں ہوتا جانے دو نا......اپنی زندگی آپ جینا کیا غلط بات ہے کچھ لوگ

اس لائن میں رہ کربھی بہت اچھے اور اعتبار کے قابل ہوتے ہیں اصل بات تو اعتبار کی ہے تم اسے منع مت کرو......کرنے دو اسے جو یہ چاہتی ہے''......ساتھ ہی ساتھ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں احسن کو اشارہ کیا کہ وہ بات کو ختم کردے۔

احسن جھنجھلاکراٹھے اور کمرے میں چلے گئے ان کے اندر ایک طوفان اٹھ رہا تھا ان کی اپنی

بیٹی انہیں اس طرح ستارہی تھی مشتعل کر رہی تھی اور وہ کچھ نہیں کرپارہے تھے ذہنی اذیت سے پریشان تھے رہ رہ کر اپنی بے خبری پر رنج ہو رہا تھا کہ انہوں نے کیوں تحریم کی یا رابعہ کی خبرنہ لی۔کاش وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتے تو حالات کچھ اور ہی ہوتے۔

ماڈلنگ کے اس آفس میں ان کے اپنے کئی جاننے والے تھے اس لئے شام کو انہوں نے سوچا کہ بات کرکے ان کی خبرلے لیں۔شام ہو رہی تھی تینوں لاونج میں ٹی وی کے آس پاس بیٹھے تھے رابعہ ٹی وی دیکھ رہی تھی مگرلاشعوری طورپر اس کا ذہن فون کی جانب تھا جہاں اس کے آڈیشن کا جواب آنے والا تھا اور تبھی گھنٹی بجی سبھی چونک پڑے احسن نے آگے بڑھ کر فون اٹھا لیا......

''ہاں......بولو شیکھرمیں بول رہا ہوں......انٹرویو ٹھیک رہا......اور آڈیشن ہاں......میں اسے جانتا ہوں...... رشتہ داری......؟اُف جسٹ شٹ اپ......''احسن نے فون پٹخ دیا اور گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے ان کا چہرہ

سرخ ہو رہا تھا انہوں نے ایک جلتی سلگتی نظر ان دونوں پر ڈالی اور کمرے میں جاکرکمرہ بند کرلیا۔شہنا نے رابعہ کی طرف دیکھا وہ بھی حیران نظر آئی۔پھر بھی بات کافی حدتک ان دونوں کی سمجھ میں آ گئی تھی۔کونسا ایسا جملہ ہوگا جس نے احسن کا یہ حال کیا......

رات کو رابعہ خود کافی لے کر احسن کے کمرے میں گئی.....تو وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹے تھے اور بیقراری سے پیر ہلا رہے تھے۔وہ کافی رکھ کر سرہانے بیٹھ گئی۔اور آہستہ آہستہ ان کے بال سہلانے لگی۔احسن نے چند لمحوں بعدآنکھوں کے اوپر سے ہاتھ ہٹایا۔

اس کا معصوم چہرہ ان کے سامنے تھا۔

''تم......آخرتم ماڈلنگ کیوں کرنا چاہتی ہو۔تم کو میرے پاس کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ تمہیں اچھی طرح پال سکوں، تعلیم دلوا سکوں میں اچھی جاب پر ہوں رابعہ......ان کی آواز میں ان کے لہجے میں ایک بے بسی اور التجاء تھی۔

''سرمیں جاب اپنے لئے نہیں کرنا چاہتی......''

''پھر......؟''

''میں دراصل ارسل کے لئے یہ سب کررہی ہوں۔''

''ارسل کون ہے.....تمہارا دوست ہے وہ......؟''

''نہیں سر......وہ میرابھائی ہے.....آپ کا بیٹا......وہ مجھ سے ڈھائی برس چھوٹا ہے۔''وہ ایک لمحہ کے لئے رکی۔اس کی آواز بھرا رہی تھی آنکھیں

آنسوؤں سے بھری تھیں۔

''میں نہیں چاہتی کہ اس کی ذمہ داری کوئی اور اٹھائے۔میں اسے اچھے اسکول میں تعلیم دلوانا چاہتی ہوں'' احسن خاموشی سے لیٹے اس کی طرف دیکھ رہے تھے جو انکشافات پر انکشافات کئے جا رہی تھی پے درپے انہیں خبریں سنا رہی تھی۔ ان کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

''میرا بیٹا......میرا اپنا بیٹا اس دنیا میں سانس لے رہا ہے اور مجھے پتہ بھی نہیں......''

''ممی نے آپ کو اس لئے نہیں بتایا سر کہ آپ اسے ان کی کمزوری نہ سمجھ لیں۔ممی بہت بہادر تھیں سر......آپ ذرا بھی نہیں ہیں۔''وہ جھٹکے سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی ان کے لئے بازگشت چھوڑ گئی۔

پہلے دن اسکرین ٹسٹ کے بعد واپس آ کر اس نے زور زور سے رونا شروع کردیا۔

''کیا ہوا......؟''

شہنا بدحواس ہوکر کچن سے نکل آئی۔مگروہ کارپٹ پر پڑی پیر پٹک پٹک کر روتی رہی بلکتی رہی۔

گھنٹی بجی دروازے پر احسن تھے......تھکے تھکے سے بریف کیس ان سے لیتے ہوئے شہنانے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔وہ گھبرا کر اس کی طرف بڑھے۔

''ارے کیوں رو رہی ہو؟ کیا ہوا......کیا بات ہے......کچھ تو بولو......؟''

وہ بیقراری سے پوچھ رہے تھے اسے سینے سے لپٹا رہے تھے......اس نے روتے روتے احسن کا سینہ بھگو دیا اور پھر اچانک ہی پر سکون ہوگئی۔

''ڈیڈی!'' میں ماڈلنگ نہیں کروں گی۔''

اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔احسن حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ وہ کمزور سی بچی جو قدم قدم پر انہیں حیرتوں کے جھٹکے دے رہی تھی...... انہوں نے اس کا سرپھراپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے بالوں پر پیار کر کے آہستہ آہستہ بولے۔

''تمہیں کوئی ضرورت نہیں نوکری کرنے کی میں جو ہوں تم کالج میں اپنا نام لکھوا لو آگے پڑھو......آج ہی ٹکٹ بک کراتا ہوں۔ ہم حیدرآباد چلتے ہیں ارسل کو لے کر آئیں گے وہ بھی یہیں رہے گا۔ہم سب ساتھ مل کررہیں گے تم دونوں ابھی پڑھو گے خوب پڑھوگے......میں ہوں نا......؟ میں ابھی زندہ ہوں تم فکر کیوں کرتی ہو کبھی مجھے پکار کے تو دیکھا ہوتا میں تو خود اپنی آگ میں جلتا رہا ہوں بیٹی۔ تمہاری ماں نے شہر بدل لیا گھر بدل لیا مجھے پتہ تک نہیں دیا مجھے اپنی کبھی کوئی خبر نہ دی میں تمہیں پاتا تو کیسے......ارسل کا تو تحریم نے کبھی مجھے بتایا تک نہیں...... شاید میں اس لائق ہی نہیں تھا۔یا پھر......وہ چپ ہو گئے۔''

شہنا نے ان کی طرف دیکھا......جیسے کہہ رہی ہو ''اور میں......؟''

انہوں نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر اسے بھی خود سے قریب کر لیا۔دونوں کو ایک ساتھ سینے سے لگا کر ایک لمبی پرسکون سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

شکستہ شیشے کا ایسا منظر

ساحرہ آپی واقعی اپنے نام کی طرح ساحرہ تھیں۔ جب ہم لوگ اس نئے مکان میں شفٹ ہوئے تو اس محلّے میں سب سے پہلے ساحرہ آپی ہمارے گھر آئی تھیں، وقت کی دبیز چادر سے نکل کر کچھ لمحے اڑتے ہوئے آئے اور میرے گال سہلاتے ہوئے چلے گئے، ان کے ہاتھوں میں ایک پھولدار چینی کی پلیٹ تھی جسمیں پانچ گلاب جامن رکھّے تھے۔

انھوں نے روپٹہ سر پر جماتے ہوئے امّی کو سلام کیا اور پلیٹ ان کے پاس تخت پر رکھ دی۔'' یہ میری امّی نے آپ کے لیئے بھجوائے ہیں نیاز دلائی تھی'' انھوں نے خوشبو دار لہجہ میں کہا، امّی نے انھیں محبت سے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ میں اسی وقت اسکول سے آیا تھا بستہ میرے کاندھے پر تھا اور میں حیرت زدہ سا ان کو دیکھ رہا تھا کس قدر خوبصورت تھیں وہ۔۔۔میںنے اپنی زندگی میں اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔دھلا دھلایا تازہ گلاب جیسا ان کا چہرہ بڑی بڑی مخمور

آنکھیں، لمبے سیاہ بال جو ان کی کمر کے نیچے تک آ رہے تھے وہ مجھے اس طرح ہونّق دیکھ کر دیکھ رہے سے ہنس دیں اور امّی نے ڈانٹا۔ یہاں کیا کر رہے ہو جاؤ بستہ رکھو منھ ہاتھ دھو'' مجھے اس وقت امّی بہت بری لگیں مجھے وہاں سے کہیں نہیں جانا تھا مگر جانا پڑا۔ ساحرہ آپی دنیا کی حسین لڑکی تھیں کم از کم اپنا تو یہی خیال تھا۔ ظاہر ہے نویں کلاس تک مینے کتنی دنیا دیکھ لی ڈالی ہوگی۔

دوسری شام جب امّی وہاں نجانے کے لیئے تیار ہوئیں تو میں بھی ساتھ چل دیا۔ جب زینہ چڑھ کر ہم ان کے گھر پہنچے تو وہ سامنے برامدے میں بیٹھی اپنی امّی سے دھیرے دھیرے کچھ بات کر رہی تھیں اور سونف کھاتی جا رہی تھیں ہمیں دیکھ کر دنکا ہاتھ رک گیا اور انھونے بیساختہ سر پہ آنچل اوڑھ لیا۔ مجھے ان کی یہ اادا بہت پسند آئی، خیر اس وقت مجھے ان کی ہر ادا اچھی لگتی تھی۔ خواتین باتوں میں مصروف ہوگئیں اور میں بری طرح بور ہونے لگا۔ ساحرہ آپی چائے لے کر آئیں اور دھیرے سے میرے پاس آ کر بولیں ''لوڈو کھیلو گے؟''

''ہاں'' میں خوش ہوگیا۔ پھر ہم وہیں برمدے میں تخت پر بیٹھ کر لوڈو کھیلتے رہے، وہ میری گوٹ جان کرنہیں پیٹتی تھیں بلکہ دوسری گوٹ چل دیتی تھیں اور میں جیت گیا، ان کی وہ معصوم مددمدّتوں میرے ساتھ رہی۔ اس دن جب ہم گھر جانے کے لیئے اٹھے تبھی باہر کے کمرے سے ان کی بڑی بہن برامد ہویئں وہ بے انتہا میک اپ کیئے ہوئے تھیں گہری سرخ لپ سٹک بالوں کے دائرے ان کے چہرے پر بھٹک رہے تھے، وہ گہرے رنگونکے کپڑے پہنے ہوئے تھین جن سے ایک تیز سی مہک اٹھ رہی تھی وہ مجھے بیحد بری لگیں۔ انھونے کچھ ایسی نظرون سے ساحرہ آپی کو دیکھا کہ وہ سہم گئیں۔ امّی نے اسی وقت جانے کی اجازت لی۔

کافی دنوں تک اسکول میں ٹسٹ وغیرہ ہوتے رہے جس کی وجہ سے میں الجھا رہا اور سب کچھ بھولا رہا۔ پھر امتحان شروع ہوگئے۔ اور میں سب کچھ بھول کر پڑھائی میں جٹ گیا۔۔ اب دسویں کلاس میں آنا کوئی آسان بات تو ہے نہیں۔۔۔۔

آ گیا دسویں میں ۔۔امتحان ختم ہوئے تو ایک بوجھ سر سے اترا۔۔۔

ایک دن ان کی امّی گھر پر آئی ہوئی تھیں امّی کے پاس کچھ اداس سی بیٹھی تھیں اور امّی ان کو سمجھا رہی تھیں کہ اللہ سب کا مددگار ہے بس اسی سے امید رکھنے سب ٹھیک ہو جائے گا۔آپ بچّیوں کا نصیب بھی وہی اچھا کرے گا آپ اتنی فکر کیوں کرتی ہیں؟ انشاءاللہ سب اچھے گھروں میں بیاہی جائیں گی۔۔امّی ان کو سمجھا رہی تھیں اور کمرے میں لیٹے لیٹے مجھے زور کی نیند آنے لگی امّی کی نرم نرم آواز لوری کا کام دے رہی تھی۔۔میں سو گیا۔۔اور خواب میں مینے ساحرہ اپّی کو دیکھا وہ میرے پاس ہی بیٹھی تھیں اور پھر انھوں ے اپنے گلابی ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے کرنٹ سا دوڑ گیا۔۔میں چونک کر جاگ اٹھا۔۔گھر میں سنّاٹا سا چھایا ہوا تھا مہمان جا چکے تھے سب اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے میرا دل گھبرائے لگا۔۔مومو پڑھنے میں مصروف تھی۔

''موموٗ' میے اسے دھیرے سے آواز دی

''ہوں'' اس نے بڑی بے دلی سے جواب دیا

''ساحرہ اپّی کی طرف چلو گی؟''

''نہیں بھائی۔۔ مجھے یہ سارے نوٹس آج ہی تیار کرنے ہیں۔۔۔'' اس نے صاف جواب دے دیا۔

میں اٹھ کر نہایا اور خوب تیار ہو کر ساحرہ اپّی کے گھر چل پڑا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں ان سے بہت کچھ کہنے کے لیئے سوچتا رہا۔وہ سامنے سے چلی آ رہی تھیں ان کے ساتھ ایک صاحب بھی تھے جو بہت مسکرا رہے تھے مجھے دیکھ کر ساحرہ اپّی سٹپٹا سی گئیں۔۔۔

آج انھوں نے بھی بے انتہا میک اپ کیا ہوا تھا کپڑے بھی بہت شرخ رنگوں کے پہنے ہوئے تھیں، ان کے کانوں میں لمبے لمبے سے جھمکے عجیب سے لگ رہے تھے۔۔۔وہ خود بھی عجیب

لگ رہی تھیں میں حیران سا ان کو دیکھتا رہا۔۔۔وہ نیچے اترتی چلی گئیں۔۔۔میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔۔۔

چند لمحوں بعد جب وہ واپس آئیں تو ان کی لپ اسٹک کچھ بجھی بجھی سی تھی۔۔۔انھوں نے میرے قریب آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو بدھو؟''

''ساحرہ اپّی! یہ صاحب کون تھے؟ اور میں بدّھو بالکل نہیں ہوں سمجھیں آپ۔۔'' میں بگڑ گیا۔

''ارے بھائی یہ تو ہمارے بھائی صاحب تھے۔۔۔'' وہ سکون سے بولیں۔''تم کیا سمجھے؟؟؟؟''

''کچھ نہیں۔۔'' میں کیا سمجھا تھا۔۔یہ بات خود بھی نہیں جانتا تھا۔

بس ان کا ہاتھ جھٹک کر گھر بھاگ آیا۔۔۔

بہت دنوں تک وہاں نہیں جا سکا۔چھٹیوں میں اپنے ننہال چلا گیا۔آیا تو اسکول شروع ہو گئے۔۔پڑھائی تھی کچھ سوچنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔

کبھی کبھی ساحرہ اپی کی آواز ذہن میں گونجتی۔۔مگر میں سر جھٹک کر پڑھائی میں مصروف ہو جاتا۔۔

آخری پیپر ہوا تو اس دن خواب میں ساحرہ اپی کو دیکھا۔۔۔ان کا دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرنا۔۔۔ان کی نرم سی ہنسی۔۔۔

''امّی میں ساحرہ اپّی کی طرف جا رہا ہوں۔۔'' صبح ہوتے ہیں میں نے ارادہ کیا۔

''چلو گی مومو۔۔؟''

''نہیں مومو کہیں نہیں جائے گی اور تمہیں بھی ضرورت نہیں یہاں وہاں گھومنے کی

میرے پاس بھی کبھی بیٹھ۔۔۔'' امّی نے خلاف توقع تیز لہجے میں جواب دیا۔۔

پھر میں احتراماً وہیں بیٹھ گیا دیر تک امّی سے بات کرتا رہا۔۔انکو مومو کی شادی کی فکر ابھی سے ستا رہی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ موموابھی بہت چھوٹی ہے۔ وہ مجھ سے صرف چار برس ہی تو بڑی تھی۔۔پھر اتنی جلدی کیا ہے؟؟؟ مگر میں امّی کی فکرون کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ ماں ہیں۔ وہ بہتر فیصلہ کر سکتی ہیں۔۔۔۔

دوسری شام میں امّی کو بتائے بغیر ان سیڑھیوں پر جاپہونچا۔۔۔

وہاں شام کی چائے پہ جارہی تھی سبھی بہنیں موجود تھیں ان کی امّی مجھے دیکھ کر مسکرائیں اور ساحرہ اپّی بھی بیحد خوش ہوگئی۔۔۔ان کے چہرے پر میرے آنے کی خوشی میں جو چمک میں نے دیکھی وہ میرے لیئے بالکل نیا احساس تھا۔۔۔

انھوں نے کاجو سے بھری پلیٹ میرے سامنے کردی۔۔

''لو کھاؤ۔۔'' ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔۔۔

میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ان کی چھوٹی بہن سامنے سے آئیں اور ایک کاجو پلیٹ سے لے کر اپنے ہونٹوں میں دبالیا پھر میری طرف شرارت سے جھکیں۔۔

''اب کھایئے۔۔'' انھوں نے اشارہ کیا۔۔ادھا کاجو جو ان کے ہونٹوں سے باہر تھا۔۔اسے لینے کو کہہ رہی تھیں۔۔۔ میں چکرا گیا۔۔میں نے ساحرہ اپی کی طرف دیکھا۔۔۔

'' جاؤ تم یہاں سے۔۔ بے شرم کہیں کی۔۔'' انھونے اپنی بہن کو زور سے ڈانٹا۔۔اور پھر دیر تک مجھ سے سکول اور پڑھائی کی باتیں کرتی رہیں میرے دوستون اور نئے کالج کی باتیں دلچسپی سے سنتی رہیں۔۔۔

ان کی آواز میں ایک طلسم تھا ان کے لہجے میں اپنا پن تھا۔۔ان کے چہرے پر محبت کی روشنی تھی میں کافی دیر بیٹھا رہا۔۔۔

رات ہونے لگی تھی۔۔گھر آیا تو امّی مجھ پر برس پڑیں۔۔

''کہاں تھے تم۔۔؟''

میرے بتا دینے پر بھی ان کا غصہ کم نہیں ہوا۔۔۔ بلکہ اس شام انھوں نے مجھے وہاں جانے سے سختی سے منع کر دیا۔۔میں بڑا ہو رہا تھا فکریں مجھے بھی ہونے لگی تھیں میں بھی کسی اور انداز میں سوچنے لگا تھا۔۔۔مگر امّی کا یہ انداز؟؟ میرے لیئے بالکل الگ تھا۔

زندگی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی مجھے پڑھنے کے لیئے دہلی میں داخلہ مل گیا اور جاتے وقت میں چاہتے ہوئے بھی ساحرہ اپّی سے نہیں مل سکا۔

نئے لوگ نئے استاد۔۔کورس کافی مشکل تھا کچھ دنوں تک تو میرا بالکل دل نہیں لگا پرانا اسکول اور پرانے دوست بہت یاد آئے مگر آہستہ آہستہ یہاں کی زندگی کا عادی ہوتا چلا گیا۔۔۔

شائد اب میں بڑا ہو گیا تھا۔۔۔زندگی کو اور طرح سے سوچنے لگا تھا۔۔۔ادھر گھر پر موموکی شادی کی تیاری ہونے لگی، میں پہونچا تو دیکھا امّی بہت کمزور ہو گئی تھیں۔۔۔دیر تک مجھے باہوں میں لیئے روتی رہیں۔۔۔

گاؤں کی زمین کا سودا ہو گیا تھا اور پھر موموکی شادی کی، شہنائیاں بج اٹھیں۔ میں دن رات مصروف رہا جس دن وہ رخصت ہوئی دیر تک روتا رہا۔

پھر واپس دہلی۔۔۔وہی، پڑھائی وہی مصروفیت۔۔

زندگی کچھ اور آگے بڑھ آئی ایم بی اے پورا ہوا تو ملازمت کے لیئے مصروف ہوا۔۔۔

امّی بیمار تھیں فون پر پتہ چلا تو بھاگ کر واپس آیا۔۔۔وہ موموکی شادی کے بعد بہت اکیلی پڑ گئی تھیں چاہتی تھیں میں جلدی سے کسی نوکری پر لگ جاؤں اور شادی کر لوں۔۔۔۔

وہ میرے آجانے سے بیحد خوش تھیں۔۔۔روز کچھ نہ کچھ میری پسند کی ڈش خود کھڑی ہو کر

بنا تیں۔۔

اس شام میرا دل اداس تھا اچانک مجھے ساحرہ اپّی کی یاد آ گئی۔سو چا امّی سے پوچھوں۔۔مگر پرانی ڈانٹ یاد آئی تو خاموشی سے ان کے گھر چل پڑا۔۔

وہاں پہونچا تو ایک سنّاٹے نے میرا استقبال کیا۔۔۔تخت پر پان دان کھلا ہوا تھا ایک میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی ان کی امی سامنے اسی تخت پر اکیلی بیٹھی تھیں۔میں انکو سلام کر کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔۔مجھے دیکھ کر آنکھوں میں شناسائی کی ایک چمک سی آئی۔۔اور پھر اسی حزن میں ڈوب گئی۔۔

''کیسے ہو بیٹا؟؟؟''ان کی آواز بہت بدل گئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔۔۔سب لوگ کہاں ہیں۔۔۔؟''میں نے زیادہ صبر نہیں کیا۔

''نادرہ تو گھر سے بھا۔۔۔چلی گئی۔۔۔شادی ہوگئی نا اس کی تو۔۔''انھوں نے عجیب طرح سے اٹک کر بتایا۔

''سمیرہ اور مائیرہ اپنے ماموں کے گھر پر گئی ہیں۔۔''

''اور ساحرہ اپّی۔۔؟''

''وہ۔۔۔اس کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔سو رہی ہے شاید۔۔۔۔''

''میں ان سے ملنا چاہتا تھا۔۔''میں نے رک رک کہا۔

''اچھا۔۔۔آؤ۔۔دیکھتی ہوں۔۔۔''

انھوں نے جھک کر نیچے پڑی چپّل میں پیر ڈلا۔۔وہ مجھے بہت کمزور اور ٹوٹی ہوئی لگیں۔

وہ مجھے لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں آ گئیں۔۔۔ مجھے بے پناہ گھٹن کا احساس ہوا۔۔۔ایک پلنگ پر ساحرہ اپّی۔۔نہیں یہ تو بس ان کا سایہ تھا۔۔وہ تو نہ تھیں۔۔۔

میرے اندر دکھوں کی بارش سی ہونے لگی۔

''کیا ہوا ہے ساحرہ اپّی کو؟؟؟؟؟'' میری چیخ سی نکل گئی۔۔

انھوں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر میری طرف دیکھا۔۔آنکھیں وہی مگر ان میں کوئی چمک نہیں۔۔۔کوئی رنگ نہیں۔۔ مجھے دیکھ کر جو مسکراہٹ ان کے بیمار لبوں پر ایک لمحے کو ابھری وہ دوسرے لمحے معدوم ہو گئی۔

میں وہاں پڑی ہوئی واحد کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔

ان کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور گوشوں کو نم کرتے ہوئے گردن تک چلے گئے۔۔

کانچ کے زرّوں کی طرح بکھری ہوئی ساحرہ اپّی میرے سامنے تھیں۔۔

''روتی کیوں ہیں؟ ٹھیک ہو جائیں گی آپ۔۔'' مینے کمزور سا دلاسہ دیا۔۔۔اب اس کمرے میں بری طرح دم گھٹ رہا تھا میرا۔۔۔میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔۔۔

اب انھوں نے پھر آنکھو پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔۔میں ایک دم باہر آ گیا۔۔پھر بغیر کسی طرف دیکھے گھر سے بھی نکل آیا۔۔۔اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔۔۔

دو آدمی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔۔۔ مجھے دیکھ کر عجیب طرح سے مسکرائے۔ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

''ان سب میں ایک ہی تو اچھی تھی۔۔مگر اب اسے بھی۔۔۔اب تو جانا بیکار ہی ہے''

''کیا ہوا ہے۔۔۔اسے؟؟'' مینے اپنے پیچھے ایک آواز سنی۔۔۔۔اور کیا ہونا تھا۔۔۔ کام ہی ایسا کرتی تھیں۔۔''

''کون والی؟

''ارے وہی۔۔ساحرہ بائی اور کون۔۔''

میں سر سے پیر تک سن ہو گیا۔۔۔

میرے گمان میرے خدشے یہاں تک نہیں پہونچ سکتے تھے۔۔۔امّی کی ڈانٹ پھر سے یاد آئی۔۔ سر سے پاؤں تک ندامت میں ڈوب گیا۔۔۔۔

☆☆☆

آزادی کے خواب

سنا تم نے......؟ اس نے میرے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے پوچھا ''صبح سے اسکول کا ہر بچہ ننھا سا جھنڈا لئے ننھی منی آواز میں آزادی کی گیت گاتا جارہا ہے......''

ارمین کے لہجے میں اک معصوم سی مسرت اور اشتیاق ہلکورے لے رہا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر ریموٹ اٹھایا اور T.V آن کر دیا......ہم دونوں ناشتے کی ٹیبل پر تھے......چائے کا بھاپ اُڑاتا کپ میرے سامنے تھا مگر دل میں اک بے کلی سی تھی۔

اب T.V پر آزادی کے پروگرام شروع ہو چکے تھے۔اک مشہور سنگر کی آواز گونج رہی تھی۔

''اب کوئی گلشن نہ اجڑے اب وطن آزاد ہے''

اور میں......اپنے خیالات میں گم ہو گیا، میرا دل نہ جانے کیوں دکھا دکھا سا ہے۔فضا میں آج بھی جب اس گیت کے بول گونجتے ہیں تو ذہن و دل اک نئی کیفیت سے روشناس ہوتے

ہیں اک جوش اک جنون، اک دلولہ اور آزادی کا احساس......

لیکن...... دل اداس کیوں ہے......؟ مجھے اس کے پس منظر میں کچھ اور کیوں دکھائی دے رہا ہے......؟

گولیوں کی آوازیں بچوں کی چیخ پکار، بم کے دھما کے اور لوگوں کے بکھرتے وجود ...... بے بسی لاچاری...... دکھ...... کرب...... کیا واقعی اب کوئی گلشن نہیں اجڑے گا......؟

کیا آزادی کے متوالوں نے اپنی جانیں دے کر یہ آزادی اس لئے مانگی تھی کہ آزادی اک خواب بن جائے......اک سنہرا خواب اور اس خواب کی تعبیر اس صورت میں سامنے آئی کہ ایک گھر کے آنگن میں ایک کمزور سی دیوار اٹھا دی گئی......اور اک ماں...... یہ کہاں برداشت کر پاتی ہے کہ اس کے بچوں میں دوریاں ہوں...... چولھے الگ ہو جائیں......کون ماں برداشت کرتی ہے یہ دکھ......؟

کیا آزادی کی جنگ میں حصّہ لینے والوں......اپنی جانیں نچھاور کرنے والوں کو یہ معلوم تھا کہ دھرتی کو یہ کرب سہنا پڑے گا اور وہ اس طرح خون سے لال ہوتی رہے گی۔؟

آزادی کے 69 انہتر برس بعد بھی لہو سے تر ہے یہ زمین ......کاش آزادی کے نام سینوں پر گولیاں کھانے والے......آئیں اور دیکھیں ملک کے مختلف علاقے۔ وہ دیکھیں دہلی کی تباہی، گجرات پر نظر ڈالیں، بمبئی کا منظر دیکھیں...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کشمیر میں روز چند جوان مار دیے جاتے ہیں یہ کہہ کر کہ وہ دہشت گرد تھے۔ سچائی پرکھنے کا کسی کا پاس وقت نہیں۔

دہلی کے بازاروں میں کس طرح موت کا بازار گرم ہوا۔ گجرات کے لوگ آج بھی بے سہارا ہیں......دہلی میں کیسی تباہی آئی کتنے گھر خالی ہو گئے......

ہندوستان آزاد کروانے والے آئیں اور تاج ہوٹل کے اندر حیوانیت کا ننگا ناچ دیکھیں۔ اک بے قصور رپوٹر جو کسی ایک کمرے میں بند تھی آخری وقت تک S.M.S کرتی

رہی......وہ تاج ہوٹل کے ایک کمرے میں بند تھی اور چاروں طرف ہولناک آوازیں بم دھماکے بارود کی بو......اس لڑکی کا آخری میسیج یہ تھا کہ ''بس اب کوئی باتھ روم میں کود کر آیا ہے'' اور پھر لائن ڈیڈ ہوگئی۔کیا ہوا ہوگا اس کے بعد۔؟

کون سوچ سکتا ہے۔کچھ لوگ مرنے والوں کی گنتی مذہب اور فرقے کی بنیاد پر کرتے ہیں۔انسانیت کی بنیاد پر نہیں۔مرنے والے کوئی بھی ہوں، ہیں تو انسان ہی۔

ایک مرتبہ حضورﷺ اک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے......ایک میت جا رہی تھی آپ فوراً کھڑے ہو گئے۔صحابہ نے سوال کیا......یارسول اللہ یہ تو مسلمان نہیں تھا۔

آپ نے فرمایا......انسان تو ہے۔

پھر ہم کون ہیں انسانوں میں فرق کرنے والے۔

کہاں ہیں دار پر چڑھنے والے آئیں اور ہندوستان کا یہ منظر دیکھیں کیسا کرب ہے کہ جگر کٹا جاتا ہے......کتنے دلوں کے اندر آگ جل رہی ہے اور اس کی تپش سے سارا علاقہ سلگ رہا ہے۔

حملہ سرحد پر نہیں ہوتا ہے گھروں پر ہوتا ہے اسٹیشنوں پر ہوتا ہے بازاروں میں ہوٹلوں میں ہوتا ہے کیا اس دن کے لئے پورے پورے خاندان کے لوگوں نے اپنے آپ کو دار کے حوالے کیا تھا۔

سرحدوں پر سر کٹانے والے دیکھیں............گھروں کے اندر چین سے رہنے والوں نے خود اذنِ حیوانیت دیا۔آؤ ہمارے عوام کے سینے حاضر ہیں۔چاہے وہ گجرات کا منظر ہو، دہلی کا یا پھر بمبئی کا............بچوں کی آہیں ان نام نہاد نگراں لیڈران کے شراب کے جام میں ڈوب رہی ہیں جوان اور بیواؤں کی سسکیاں ان کے ناچ رنگ میں دھندلائی ہیں ماؤں کی چیخیں ان گھر کے بھیدیوں کے کانوں تک ہی نہیں پہونچ رہی ہیں کہ کانوں پر ہیڈفون چڑھے ہیں جس میں تیز

موسیقی ہےلطف وانبساط ہےلوگوں کا اعتماد ریزہ ریزہ ہورہا ہے............

کہاں تھیں وہ نگراں نگاہیں۔ وہ سیکورٹی جو معصوم عوام کو پریشان کرنے کے لئے ہے، نام کے لئے ہے۔

پوری دنیا کی بات کریں ۔تب بھی دلوں کو قرار کہاں ہے جب نگاہ اٹھتی ہے کشمیر،سربیا،لبنان،شام،عراق ہرطرف کے حالات وواقعات سامنے ہیں پوری دنیا میں ظلم و بربریت سفاکی،آبروریزی قتل وغارت گری کے گدھ کیوں منڈلال رہے ہیں؟ امن وسکون کہاں ہے؟ انصاف اورطمانیت اوررحم کے پودے کیوں خشک ہوگئے ہیں اور پھر جب یہ سب کچھ ہرخطے سے معدوم ہوگیا۔امن ہتھیاروں تلے دب کرسسک سسک کرسوگیا،انصاف کے معنی جانب داری کے لئے جانے لگے مسرت ،طمانیت ،رخصت ہوچکی تو اس حالت میں کون آزاد ہے؟ کہاں آزاد ہے؟

''کاش......کاش......ریموٹ میرے ہاتھ میں ہوتا''

بےساختہ یہ جملہ میرے منہ سے نکل گیا............

''پھرتم کیا کرتے ۔۔''ارمین ابھی تک چینل سرچ کررہی تھی۔

''میں اک ایسا چینل فکس کردیتا جوکبھی نہ بدل سکتا۔''

''کون سا چینل؟''اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''محبت،امن، بھائی چارےاورمسرت کا۔اک ایسی مسرت کا جومحبت کی خوشبو سے پھوٹتی ہے،اک ایسی مسرت جو دوست کو گلے لگا کرملتی ہے۔ایک ایسی مسرت جوکسی ضعیف کا ہاتھ پکڑکر سڑک پارکروانے میں ملتی ہے۔''

ارمین نے حیرت سے مجھے دیکھا......اس نے پھر چینل چینج کیا یہاں اک اورنغمہ آرہا تھا۔

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو

☆☆☆

خراشیں

وہ بستر پر یوں پڑے تھے جیسے کوئی سمٹی ہوئی چادر پڑی ہو۔حالانکہ ماموں بے حد نفیس طبیعت کے مالک تھے،انھیں دیکھ کر مجھے بہت رنج ہونے لگا۔۔۔اپنے بارے میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتے تھے مگر میری ضد کے سامنے ہار گئے ،اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔میں پاس پڑی کرسی پر بیٹھا تھا۔سامنے آم کا باغ تھا اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔۔۔وہ کافی دیر خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔۔۔پھر ماضی میں بہہ گئے اور آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"اس دن صبح تو روز جیسی تھی مگر نہ جانے کیوں میری آنکھ پھڑک رہی تھی ،جس کام کے لئے باہر گیا ہوا تھا وہ بھی نہیں ہوا۔بازار کی رونقوں اور سڑک کے شور وغوغا سے گھبرا کر جلدی جلدی گھر کی جانب روانہ ہوا۔دروازے کے سامنے برامدے میں زاغ انگور لئے بیٹھا تھا۔۔۔وہ ہمارے رشید بھائی۔۔۔جو ہمارے ابّا کے دور کے رشتہ دار۔پچھلے محلّے میں رہا کرتے تھے نہایت بد شکل وبد ہیبت تھے مگر بیوی ایسی ملی تھی کہ لوگ رشک کرتے تھے۔۔۔اسی نسبت سے باجی کہا کرتی

تھیں۔"زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت۔پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت"۔

مجھے دیکھا تو جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا پھر ہنستے ہوئے گلے بھی لگ گئے۔میں نے شرمندہ ہوکر کرتے کی جیب سے کنجی نکالی اور دروازہ کھول کر انھیں اندر بلایا۔کمرہ برے حالوں میں تھا۔رشید بھائی سے تو کیا شرمندہ ہوتا انگور سے خجالت ہو رہی تھی۔وہ جو پہلی پہلی بار میرے گھر آئی تھیں،کالے برقے میں بادام آنکھیں چمک رہی تھیں ،جارجٹ کی نقاب،گلابی ہونٹوں کو اور بھی اجاگر کر رہی تھی صحن میں کھلے گلابوں کی ساری پنکھڑیاں شرمندہ شرمندہ لگ رہی تھیں۔وہ دونوں میرے کمرے کے واحد پلنگ پر ٹک گئے۔اور میں"

ابھی آیا۔۔" کہہ کر باورچی خانے کا جائزہ لینے پہونچا۔فریج سے کچھ پھل اور ڈبّے سےبسکٹ پلیٹ میں ڈال کر چائے لے کر واپس کمرے میں آیا تو ان کی انگلیوں نے کمرے کی قسمت سنوار دی تھی،تولیہ کھڑکی کے پاس ہنگر میں جا ٹنگا تھا اور بستر پر چادر کی ہر سلوٹ غائب تھی۔کرسی پر پڑے کپڑے ایک جانب رکھّے ہوئے ٹین کے ٹرنک پر تہہ کئے رکھّے تھے،میں پانی پانی ہو گیا۔

معمولی سی چائے اور ناشتے کے بعد رسمی باتوں کا سلسلہ بھی رُک رُک کر چلا۔اذان ہونے لگی تھی،اور اسی آپا دھاپی میں میں اپنی ٹوپی نہ جانے کہاں گرا آیا تھا،ادھر اُدھر ڈھونڈتا پھرا۔۔۔تب ہی انھوں نے اپنے بیگ سے ایک بادامی بڑا سا رومال برامد کیا۔

"یہ لیجئے۔۔۔۔"انھوں نے میری طرف بڑھایا تو میں رشید بھائی کی جانب دیکھنے لگا۔

" ارے بھائی۔۔۔لے لو نماز ادا کر آتے ہیں تب تک یہ یہیں رہیں گی۔۔۔۔۔چلیئے"انھوں نے قدم باہر بڑھائے تو ناچار میں بھی چل پڑا۔

نماز کس کمبخت نے ادا کی نہ جانے کون کون سے خیالات ذہن میں شورش مچا رہے تھے۔گاؤں میں امّی نے بتایا تھا کہ یہ رشید بھائی کی چچازاد ہیں اور ان کی والدہ اس بے جوڑ شادی

پر راضی نہ تھیں مگر جائیداد دوسرے خاندان میں چلے جانے کے خوف سے رشید بھائی سے نکاح لازم ہو گیا۔

وہ دن تو گزر گیا مگر اب پوری زندگی کیسے کٹے گی۔سوچ کر میرا کلیجہ منھ کو آتا تھا میں نے تو رابعہ کے بعد کسی کو نظر بھر کے دیکھا بھی نہ تھا۔اس کے جانے کے بعد ساری زندگی اکیلے رہنے کی ٹھانی تھی مگر یہ عجب ماجرہ ہو گیا تھا کہ دل کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔آپ ہی آپ مسکراتا تھا،آپ ہی آپ رونے کو دل چاہتا۔اور وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب میری روتے روتے ہچکی بندھ گئی،سڑک کے کنارے شیشم کے درخت کے نیچے نہ جانے کب تک بیٹھا روتا رہتا جو مسجد سے نکلتے ہوئے رشید بھائی کی نظر نہ پڑ جاتی۔وہ مجھے گلے لگائے ہوئے اپنے گھر لے آئے پانی پلایا اپنے ہاتھ سے میرا منھ دھلایا۔اور اندر سے شربت کا گلاس کشتی میں رکھ کر پردے کے اس پار آیا تو کشتی اور شربت دونوں کپکپا رہے تھے اسی جل ترنگ میں کانچ کی چوڑیوں کی آواز بھی ہم آہنگ تھی۔

شام کو اجازت چاہی۔مگر نہیں ملی رشید بھائی نے سختی سے اکیلے رہنے کو منع کر دیا اور گاؤں چلے جانے کی تجویز رکھّی۔مگر پھر نوکری کا کیا ہوتا۔۔اس لئے ممکن نہ ہوا۔مگر رشید بھائی نے کمرے پر نہیں جانے دیا۔تین دن تین راتیں اسی طرح گزریں۔۔چوتھے دن جب وہ کام پر نکل گئے تو میں نے کلام کرنے کی ٹھانی۔زنجیر بجائی تو وہ دروازے کی آڑ میں آگئیں۔

کچھ میں نے کہا کچھ انھوں نے جواب بھی دیا۔نتیجہ یہ تھا کہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔"

میں نے پھر اپنے کمرے پر جانے کی ضد بھی نہیں کی بلکہ رشید بھائی کے ساتھ جا کر چند جوڑے کپڑے بھی لے آیا۔

اُس دوپہر میں جلدی واپس آ گیا تھا۔وہ دروازے پر تھیں میں اشعار سنا رہا تھا وہ داد دے رہی تھین اور تبھی میں نے حالِ دل کہہ ڈالا۔اندر سے سسکی کی آواز آئی۔۔اس سے پہلے کہ میں ان کے آنسو پونچھتا ، پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتّھر کا ہو گیا،رشید بھائی خاموش اُداس نگاہوں سے

مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ وہاں سے اٹھا تو اپنے کمرے پر آ کے دم لیا۔ چند ساعت گزری ہوں گی کہ رشید بھائی سر جھکائے ہوئے موجود تھے میں احساس ندامت سے چُور چُور تھا وہ کچھ دیر کھڑے رہے۔۔ پھر آہستہ آہستہ گویا ہوئے۔

"میں ناہید بیگم کو تمہیں سونپتا ہوں میں تو واقعی ان کے لائق نہیں، کل قاضی کے سامنے طلاق دے دونگا اور عدّت گزر جانے پر تم انھیں۔۔۔۔۔۔" میں زار و قطار رونے لگا میں نے اپنا آپ ان کے قدموں میں بچھا دیا۔ اور تڑپ تڑپ کر معافی مانگی۔ اُدھر اک جامد سنّاٹا تھا۔ میں نے انھیں اس عمل سے روکنے کے لئے امّاں کی قسمیں کھائیں۔۔۔ اور اسی دن سامان سمیٹ کر نوکری پر لات ماری اور گاؤں کے لئے روانہ ہوا۔

وہ ماضی سے واپس آ گئے اور بولے' وہ دن یاد آتا ہے تو زار زار روتا ہوں مگر اپنے آپ کو معاف کرنے کی ہمّت اب بھی نہیں مجھ میں۔۔۔۔ اللہ مجھے معاف کرے" وہ کمر پکڑ کر بستر سے اٹھے، کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے آنسو صاف کئے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ تکیہ کے نیچے سے اک بادامی بڑا سا رومال نکالا اور نماز کے لئے مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔۔ میں دم بخود تھا۔ اب ان سے کیا کہتا۔

☆☆☆

روٹی اور گلاب

"باجی روٹی دے دو۔۔۔۔۔۔" وہ پھر آج صبح صبح دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔میلا کچیلا سا شلوار سوٹ بالوں کی میلی لٹیں چہرے پر بکھری ہوئی ،تیرہ ،چودہ برس کا سِن ،ذہین معصوم آنکھیں۔اور یہ لاچاری۔

ایک دفعہ تو میں نے بھی منع کر دیا تھا۔

"جاؤ ابھی روٹی نہیں پکّی۔۔۔" وہ سر جھکائے اگلے گھر کی طرف مڑ گئی مگر مجھے اچانک بے حد رنج ہوا کچھ اور دیدیتی بسکٹ یا ڈبل روٹی کچھ بھی۔۔۔۔روز تو نہیں آتی تھی وہ۔۔۔محلّہ میں اکثر لوگوں نے منع کیا تھا کہ یہ لڑکیاں چور ہوتی ہیں کبھی گھر کے اندر نہ بلائیے گا۔آنکھوں کا کاجل چراتی ہیں آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا،اپنا کام کر جائینگی۔

آج جب وہی آواز پھر سنائی دی۔

"باجی روٹی۔۔۔۔۔" تو ایک لڑکی اور ساتھ کھڑی تھی۔۔۔۔

"اچھا ایسا کرو۔۔ یہ زینہ کے ساتھ بہت کوڑا ہے جھاڑو لے لو اور دونوں مل کر یہاں صفائی کر دو پھر لے جانا روٹی۔۔۔۔۔"

گھر کے پیچھے کا دروازہ کھول کر میں نے جھاڑو دینے کے لئیا ندر بلایا۔ وہ اندر آئی تو گملے دیکھنے لگی۔۔۔ساتھ والی لڑکی سے بولی۔

"دیکھ کیسا بڑا سا گلاب کا پھول ہے۔۔۔"وہ دونوں دوسرے پھولوں پر بھی تبصرہ کرتی جارہی تھیں۔ میں نے جھاڑو دے کر انہیں باہر بھیجا اور خود بھی کچھ دیر ان گلابوں کو دیکھتی رہی۔

کافی دیر تک دونوں مل کر صفائی کرتی رہیں۔ میں نے ایک پولیتھین میں کئی روٹیاں اور رات کا سالن لپیٹ کر رکھ دیا پھر دس روپے بھی ساتھ ہی رکھ دیے۔ وہ بڑی دلجمعی سے صفائی میں جٹی ہوئی تھیں میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا بھولا سا چہرہ، گورا رنگ جو کہ دھوّں اور میل کی وجہ سے کم ہی نظر آ رہا تھا، میلے میلے ہاتھ پاؤں جمپر کی آستنٹ پھٹ کر لٹک رہی تھی۔ پرانا سا کڑھائی والا کرتا شلوار جو کسی نے از راہِ ہمدردی دیا ہوگا۔

اسے بھی پھول اچھّے لگتے ہیں؟؟ کتنی خوشی سے کہہ رہی تھی وہ۔

کوئی بات نہیں میرے پاس تو بہت سارے پھول ہیں یہ گلاب اس کو دے دوں گی۔ میں نے بڑی احتیاط سے گلاب کو شاخ کے ساتھ نکالا۔ وہ پیچھے جھاڑو رکھنے آئی۔

"یہ لو۔۔۔۔" میں نے گلاب کا بڑا سا سرخ پھول اس کی طرف بڑھایا۔اس کا چہرہ خطرناک حد تک سفید ہو گیا۔۔۔

"ہم کو روٹی دے دو باجی۔۔۔۔" وہ ہکلائی۔۔میں نے دوسرے ہاتھ میں لیا ہوا پولیتھین آگے کیا،اس نے جھپٹ کر پولیتھین میرے
ہاتھ سے لیا اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اور میں گلاب کا پھول انگلیوں میں تھامے کھڑی ہوں۔۔ کہتے ہیں دُکھ غیب کی آنکھیں کھول دیتے ہیں۔

☆☆☆

قربِ قیامت

"بھیّا ہو۔۔۔۔۔دیکھوای بکری گابھن ہے جانو"

"ہوں۔۔۔۔۔۔" دادنے حقّہ کی منال منھ سے لگا کر اک لمبا کش لیا۔

"ای کا چرائے کھاتر لے جائی کہ ناہی۔۔۔۔"

"لے جاؤ لے جاؤ۔۔۔۔اچھّا ہے کچھ گھانس پتّے کھائے گی، نہر کا تازہ پانی پیئے گی تو جان آئے گی نا۔۔۔ابھی تو کچھ دن لگیں گے ؟ جب دن قریب ہوں تو چھوڑ جا نا باڑے میں۔۔۔"انھوں نے پیر تخت سے نیچے لٹکائے تو غفور نے جلدی سے ان کے جوتے پیر کے پاس کر دیئے۔اور بکریوں کو ہنکا تا ہوا باہر نکل گیا۔

اس نے دالان کے کونے میں کھڑے ہو کر ساری بات سنی۔ابھی ابھی اسکول سے واپس آیا تھا کپڑے بھی نہیں بدلے تھے بھاگ کر دادا سے لپٹ گیا۔۔۔

"دادا۔۔۔۔۔میں کھیلوں گا ان بچّوں سے۔۔۔۔کب آئیں گے بکری کے بچّے ؟"

" آ جائیں گے آ جائیں گے۔۔۔چلیئے پہلے کپڑے بدلئے کھاناوغیرہ۔۔۔چلیئے اندر آپ کی امیّ انتظار کرتی ہوں گی۔۔"

وہ دوڑتا ہوااندر چلا گیا۔۔۔۔۔

جب سے جاوید کے ابّا محاذ پر گئے تھے وہ دادا سے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔رات کوان سے بغیر کہانیاں سنے اسے نیند بھی نہیں آتی تھی۔۔۔وقت گزرتا چلا جار ہا تھاایک رات کھانے کے بعد وہ دادا کے پاس کہانی سن رہا تھا۔

"ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔۔خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔۔۔" وہ کہانی اسی طرح شروع کرتے تھے۔۔

" کسی شہر میں ایک بادشاہ رہا کرتا تھااس کی سات بیٹیاں تھیں وہ ان سب سے بہت محبّت کرتا تھا۔ایک بار۔۔۔۔۔۔۔"

"بھیّا ہو۔۔۔۔۔بکری بیانی ہے۔۔۔(بکری نے بچّے دیے ہیں) باہرڈیوڑھی سے غفور کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی "دادانے مڑکراس کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھااورآواز آہستہ کر کے بولے "ہاں ہاں تو ٹھیک ہے پانی گرم کر کے نہلا دوانھیں۔۔۔۔۔"

"بھیّا جرا دوارے تو آیئے۔۔۔۔دیکھیئے تو۔۔۔۔" غفور کی آواز کپکپا رہی تھی۔دادا کچھ حیران ہو کر باہر نکل گئے تب اس نے رضائی اپنے پیروں سے ہٹائی اور آہستہ قدموں سے پلنگ سے اتر کر دالان میں جھانکنے لگا

غفور آہستہ آہستہ کچھ بات کررہا تھا اور دادا خاموش تھے، پھر وہ اندر آنے کے لئے مڑے تو وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔۔

"دادا ہم بھی دیکھیں گے بکری کے بچّے۔۔۔"

"اندر چلو۔۔۔" دادا زور سے بولے تو وہ حیران ہوا مگر اس نے سامنے پڑے ہوئے ننھے وجود دیکھ ہی لئے تھے۔۔وہ سہم کر بھاگتا ہوا کمرے میں آیااور رضائی اوڑھ کر بھی کانپتا رہا تھا

دادا کب آئے اور کب ان کے خراٹے گونجنے لگے وہ اپنی آنکھیں بند کیئے خاموش لیٹا رہا۔۔۔دو ننھے وجود اس کی نگاہوں میں گھومتے رہے۔۔نہ جانے کب تک وہ ڈرتا رہا اور کب نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔۔۔۔۔

صبح ہلکے اجالے میں دادی اور امّی کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔

"غضب خدا کا۔۔انسان بالکل وحشی ہو چکا ہے۔۔یہ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔۔اپنے نفس پر ذرا قابو نہیں۔بے زبان جانور کو بھی نہیں چھوڑتے۔۔توبہ توبہ۔۔کیا قہر ہے"

وہ گھبرا کر اٹھ گیا اسے رات کی ساری باتیں خواب کی طرح یاد آنے لگیں۔۔پھر اس نے سنا وہ بکری کے بچّے رات ہی کو ختم ہو گئے تھے۔۔اس کی نگاہوں میں ایک بار پھر وہ نومولود بکری کے سر اور انسان کے جسم والے عجیب الخلقت بچّے آ گئے۔۔۔وہ کئی دن تک سہا سہا رہا۔۔۔وہ سونے کے لئے لیٹتا تو وہ بکری کے منھ اور انسانی جسم والے بچّے آ کر اسے ڈرانے لگتے۔۔۔۔اس نے کہانیاں سننا چھوڑ دیا تھا۔۔امّی کے پاس سونے لگا

مگر سوتے وقت اس بات کو یاد کر کے کانپ جایا کرتا تھا۔کئی دن گزر گئے تھے ابّا کا فون بھی آ گیا تھا وہ چھٹی لے کر آنے والے تھے۔

وہ صبح بھی روز جیسی تھی مگر وہ ابھی تک بستر میں تھا۔امّی بہت دیر سے ناشتہ لئے بیٹھی تھیں،انھوں نے کئی بار اس کو آواز دی۔۔پھر خود آ گئیں اور اس کا سر سہلا کر اسے جگانے لگیں

"اٹھ جا بیٹا۔۔۔اسکول نہیں جائے گا تو اپنے ابّا جیسا کیسے بنے گا۔۔اٹھ جا میرے لعل۔۔۔۔"وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لاڈ اٹھواتا رہا۔۔۔پھر بے دلی سے اٹھ کر تیّار ہونے لگا۔جب وہ اسکول جانے کے لئے تیّار ہوا تو موسم کافی بہتر تھا کھلی کار میں خوشگوار ہوا سے اس کا دل ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔۔۔چاروں طرف پھیلے ہوئے راستے کے پیڑوں میں شور مچاتی ہوا بہت اچھ ?ی لگ رہی تھی صبح صبح کا سہانا منظر خوبصورت لگ رہا تھا۔۔۔پیڑ کے پتّوں پر رکی ہوئی شبنم رہ رہ کر قطرہ قطرہ برس رہی تھی۔اک دھند تھی جو چھٹ رہی تھی۔۔۔

کلاس میں جاتے ہوئے کئی بچّوں نے اس کی خیریت پوچھی وہ گنگنا تا ہوا اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔۔۔ایک ساتھی سے اس کی کاپی لے کر نوٹس اتارنے لگا۔

اچانک عجیب شور سا محسوس ہوا سارے بچّے کلاس روم سے باہر دیکھنے لگے ،تڑا تڑ گولیاں چل رہی تھیں اک بھگدڑ سی ہو رہی تھی ہر طرف اندھا دھند گولیاں برس رہی تھیں وہ غائب دماغی سے بچّوں کی چیخیں سن رہا تھا۔۔وہ دوڑ کر سامنے بنے ہوئے آتش دان میں چھپ گیا۔اپنے آپ کو آتش دان میں چھپا کر اپنا بستہ اس نے سامنے کر لیا۔۔۔۔۔کلاس میں اب کئی لوگ آ چکے تھے بچّوں کی فلک شگاف چیخیں اسے دہلا رہی تھیں۔دور کہیں دادی سورۃ واقعہ پڑھ رہی تھیں " جب زمین بڑے زوروں سے ہلنے لگے گی اور پہاڑ ٹکرا کر چور چور ہو جائینگے پھر ذرّے بن کر اڑنے لگیں گے۔۔" وہ ترجمہ سنا رہی تھیں شاید یہ وہی وقت ہے۔۔۔رونے اور چلاّنے کی آوازوں سے کان پھٹے جا رہے تھیا فراتفری کا عالم تھا گولوں کی آواز۔۔۔بارود کی ناگوار بو۔۔اب اس کے پاس آ گئی تھی۔۔وہ دعائیں کر رہا تھا کاش کوئی آجائے اسے اور اس کے دوستوں کو بچالے۔۔۔اپنی بھینچ کر بند کی ہوئی آنکھیں کھولیں تو کچھ سائے اس کے سامنے تھے ،سامنے سے بستہ ہٹ چکا تھا وہ رائفل کی زد میں تھا اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔اور حیران رہ گیا اس کے سامنے انسانوں کے چہروں والے کئی بھیڑیے کھڑے تھے۔۔۔۔دادی کی آواز ابھی تک آہستہ آہستہ سنائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔اور پھر سب کچھ محو ہو گیا۔۔۔۔

☆☆☆

پردیس کا سچ

بھّیا سلام!

جب سے ہیاں آئے ہیں، ایکّو رات نیند بھر کے ناہی سوئے سکے ہیں۔کا بتائی کون کون مصیبت ما پڑ گئیں ہیں۔

تم تو ہمکا پہلن منع کرت رہو۔۔کہ گاؤں مارہو، جون روکھا سوکھا ملے اوکا بی بچّن کے ساتھ مل جُل کے کھاؤ پیو۔۔بھیّا تم تو ہمکا کھیت دیے رہو۔۔ملاُ کا بتائی۔۔بس ہمار بدّھی بھرشٹ ہوگئی رہئے۔۔۔کوسن دور ہیاں بمبئی ما آگئین ۔۔نہ کھائے کا ٹھکانا۔۔نہ سووے کی ٹھور۔

جب پی سی او سے پھون کرت رہن تو بی بی پوچھت رہئے۔۔۔۔کا کھائو۔۔۔۔؟

ہم جھوٹ کہہ دیت رہن کہ پیٹ بھر کھا وا ہے۔۔۔ملاُ بھیّا۔۔۔کبھو پیٹ بھر نہ ملا۔۔پیسہ بچاوے کے چکّر ما بھوکا سو جائت رہے۔۔۔

دن بھر مجدوری کرت رہین ، جون کام ملا کیا۔۔۔بھیّا اتّا کام ہم کبھو نہیں کئے رہین۔۔ملا پیسا جوڑے کے کھاتر لوگن کا سامان اٹھاوا، گھر میں چونے کاری بھی کیا۔۔۔بوجھا

ڈھووا، جوکونو کام بتائے دیت رہے وہی کر لیت رہن ۔۔۔ کہ کچھ پیسہ جمع ہوئی جائے تو بچّن کا بھیج دئی ،ایکّو دن آرام نہیں کیا چھٹّی نہیں کیا اور رات کا کبھی فٹ پاتھ اور کبھو کسی پارک ما ۔۔۔ جہاں جگہ مل جائے تھک کے پڑ جات رہن ۔۔۔۔ مگر بھیّا نیند نہیں آوت رہئے ۔۔۔ بی بی بچّن کی صورت آنکھن ما چلت رہیئے ۔۔۔۔۔ اتنی سیوا کبّو امّاں ،بابا کی نہیں کیا۔ ابکّی گھر آئے جابے تو امّاں اور بابا کا کونو کام نہ کرئے دیب۔

دوئی برس ہوئی گوا۔۔۔۔ کچھ دن پہلے ڈبّہ دیکھا تو بہت سارا پیسہ جمع کر لئے تھے ۔۔۔ مارے کھوشی کے کا بتائی کا حال ہوا ۔۔۔ بس ٹکٹ کھریدلیا۔ دس دن بعد ریل گاڑی ما بیٹھ گیئن ۔۔۔۔

ایک جنے اور ہمرے ساتھ رہیں ۔۔۔ ارے وہی چھدنّ بابو کے بٹوا ۔۔ ارمان ۔۔۔۔ وہو مجدوری کرت رہیں ہمرے ساتھ۔

ہم دونوں ساتھ بیٹھ کے گِنا ۔۔۔ ہمرے پاس بیس ہجار اور انکے پاس پندرہ ہجار رہیں۔ ہم کہا کونو بات نہیں ۔۔ مگر ارمان تھوڑا پریسان رہا ۔۔ رات ما گاڑی ما بیٹھ کے کھوب گاوا بجاوا ۔۔۔ اور کئی جنے ہمرے پاس بیٹھے رہے ۔۔ ہم چائے پلاوا سبکا اور او جون بیٹھے رہئے ہمکا بسکٹ دِہن ۔۔۔

بس بھیّا ! وہی گجب ہوء گوا۔۔۔۔۔۔ بسکٹوا کھائے کے ہم دونوں جنے سوئے گئے۔ اتنے دنن سے سوئے نہیں رہے ،اب جو سوئے تو کونو کھبر نہ رہی ۔۔ اور جب اٹھے تو کونوں اسٹیسن رہا ۔۔ ٹی ۔ ٹی ۔ ٹکس مانگ رہا ۔۔۔ مگر ہمرا بیگ کہوں نہ ملا ۔۔ چھدّن بابو کے بٹوا ارمان ۔۔۔ ان ہو کا بیگ ناہی رہا ۔۔۔ ہم دونوں کا ٹی ٹی مار مار کے وہی اسٹیسن پر اتار دہس ۔۔۔۔ بمبئ کا کونوں دوسرا اسٹیسن رہا۔

اب کا بتائی ۔۔ روت روت ہم دونوں تھک گئے مگر کچھو نہ ہوا ۔۔۔ نہ بیگ ملا نہ پیسہ ملا ۔۔

اب پھر ہیاں مجدوری کرت ہیں ۔۔۔

بھیّا ای سب بات ہمری بی بی کا نہ بتائیو ۔۔۔

اب کرائے بھر کا پیسہ جمع کر لیئی تو آئے کے تمہرے کھیت پر ہی کام کر بئیے ۔۔ بھیّا رکھ لیہو

نہ ہمکا؟

اب کہوں نہ جا بئے۔۔۔۔

بس ای کھت بڑی مسکل سے خود ہی لکھ رہا ہوں۔۔۔بڑی چوٹ کھا وا ہے۔۔تمہری

بات نہ مان کر۔۔ہمکا ماف کر دیو بھیا۔۔۔

تمہرا اپنا نوکر سمسو الدین۔

بمبئی سے۔

☆☆☆

قصّہ آم کے باغ کا

جیسے ہی آم کے پیڑوں میں بور آتے ہیں، کوئل نہ جانے کہاں کہاں سے آ کر گنگنانے لگتی ہیں، صبح شام اک پیاری سی دھن کو۔۔کو۔۔۔وووووکی آنے لگتی ہے۔دو پہر میں یہ آواز لوری سی محسوس ہوتی۔۔۔نیند آنے لگتی۔۔بور کی دھیمی دھیمی خوشبو حواس پر چھانے لگتی ہے۔

دھیرے دھیرے بور ننھی ننھی کیریوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں گویا پورے باغ میں آم کے پیڑوں پر سبز موتی جھلملانے لگتے ہیں اک ہری سی خوشبو ساری فضا میں پھیل جاتی ہے۔ہلکی ہلکی بارش میں یہ موتی اور بھی چمک جاتے ہیں۔۔ساتھ ہی بارش کے ننھے ننھے قطرے ان سبز موتیوں میں سفید موتی بھی جڑ جاتے ہیں۔گو یا بہار آجاتی ہے پیڑوں میں جھولے ڈالے جاتے۔۔لمبی لمبی پینگیں لی جاتیں۔۔گیت گائے جاتے۔۔دن کیسے گزرتا کچھ خبر نہ ہوتی۔وقت کچھ اور آگے بڑھتا ہے تو کوئل کی آواز اور خوبصورت ہو جاتی ہے اور یہ ننھے موتی کیریوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔۔یہ باغ ہمارے گھر کے بالکل سامنے ہے اسے ہمارے ابّی نے اپنے

ہاتھوں سے لگایا تھا،ایک ایک قلم ملیح آباد سے لے کرآئے اورانھیں اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا اور ان کی آبیاری کی۔۔

کیریوں کا اپنا اک مزا ہوتا ہے جب ہم پیڑ کی ڈالیوں پر بیٹھ کر دامن میں بھری ہوئی کیریوں کو نمک مرچ کے ساتھ چٹخارے لے کر کھاتے تو زندگی کا مزا آجاتا۔اس موسم میں آندھیاں بھی خوب آتیں۔۔۔۔۔پورا باغ چھوٹی چھوٹی کیریوں سے پٹ جاتا۔ان کو چھیل کر کھٹائی سکھائی جاتی گاؤں سے عورتیں آ کرکھٹائی چھیلتیں اورموسم کے گیت گاتیں پھراپنے حصّے کی کھٹائی لے کرگھر چلی جاتیں۔۔۔یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا۔

ایک بارہم نے ابّی سے پوچھا۔

"اس موسم میں اتنی آندھیاں کیوں آتی ہیں؟ اللہ میاں ہم کو اتنے سارے آم دیتے ہیں پھران کا کتنا سارا حصّہ آندھی میں گرجاتا ہے ہم کو سارے آم نہیں مل پاتے۔۔۔ایسا کیوں"؟

تب انھوں نے جواب دیا۔

"یہ آم گرنا ضروری ہے بیٹا۔کہ اگر سارے آم بڑے ہوگئے اورنہیں گرے تو پیڑ اتنا وزن کیسے اٹھا سکے گا؟اور پیڑ اس وزن سے گر بھی سکتا ہے نا۔۔اور جو یہ آم بچتے ہیں یہ زیادہ صحت بخش اور تندرست ہوتیہیں۔۔۔ان آموں نے ہر سرد و گرم سہا ہے۔۔تکلیف سہی ہے۔۔تو یہ زیادہ قیمتی ہوگئے ہیں۔یہ قدرت کا علاج ہے ان پھلوں کے لئے "اور میں مطمئن ہوگئی۔

چٹنی بنتی،اچار ڈالے جاتے اورطرح طرح کی چیزیں دسترخوان پر سجتیں۔"نمکی" یہ جھٹ پٹ تیار ہوجاتی۔۔۔کچے آم کو کدّو کش کر کے اس میں نمک مرچ تیل،کلونجی ملائی جاتی اور دھوپ میں رکھ دیا جاتا۔۔۔۔۔اسے فوراً بھی کھایا جاسکتا ہے۔

اب آیا آم پکنے کا موسم۔۔۔۔۔بہت احتیاط سے آم کی پال ڈالی جاتی۔پہلے ایک

آدمی پیڑوں پر چڑھ کر آم اتارتا اور نیچے کھڑا ہوا اس کو کیچ کر کے ڈلیا میں رکھتا۔۔۔اسی طرح فصل کے حساب سے تھوڑے تھوڑے آم اُتارے جاتے۔۔بغلی کمرے میں بچھے بڑے سے تخت پر پیال بچھایا جاتا۔۔۔(دھان کا بھوسہ) اسپر ایک ایک کر کے نہایت احتیاط سے آم رکھّے جاتے۔اگر کوئی ذرا سی بد احتیاطی سے آم زور سے رکھتا تو ابّی فوراً کہتے "ارے رے رے۔۔۔سنبھال کے۔۔آرام سے دیکھو چوٹ نہ لگ جائے ورنہ خراب ہو جائے گا" پھر کمرے کی زمین پر بھی پیال بچھایا جاتا اور اس پر بھی آم سجائے جاتے پھر ان سب پر پیال ڈھانک دیا جاتا۔

چند دنوں بعد دھیرے دھیرے ایک ایک آم دیکھ کر کہ تیأر ہو گیا، نکالا جاتا۔اور بڑی سی پیتل کی لگن میں آم بھگو دیے جاتے۔یہ کام کھانا کھانے سے پہلے کیا جاتا۔کھانے کے بعد آم کا نمبر آتا۔۔نہایت نفاست سے آم کھائے جاتے۔

فصل میں پہلے زرد آلو،(آم کا نام ہے) اور لنگڑا پک کر تیاّر ہوتے۔پھر دھیرے دھیرے دسہری، ذکی پسند ثمر بہشت ملیح آبادی سفیدہ، سُرخا، وغیرہ تیار ہوتے اس درمیان اور بھی آم پک جاتے تھے جیسے کالا پہاڑ، مالدہ، طوطی منقار، آمن فجری گولا، امروتہا،

مگر ہم لوگ ان آموں کو سکنڈ نمبر پر رکھتیز یادہ تر کام والوں اور گاؤں کے بچوّں میں بانٹ دیتے۔اس زمانے میں فقیر بھی آم لے کر بہت خوش ہو جاتے تھے۔

اب کبھی کبھی وہ آم یاد آتے ہیں، کہ جو اب بازار میں ملتے ہیں اس سے تو اچھے ہی تھے۔

آخری فصل میں لکھنؤ کا سفیدہ اور چونسے کی باری آتی، چونسے کی خوشبو سارے گھر میں پھیل جاتی۔۔۔بہترین اور میٹھا مزے دار آم۔۔۔چونسا۔۔۔

جو فصل کے آخیر تک ساتھ دیتے وہ تخمی آم ہوتے تھے ان کو چوس کر ہی کھایا جا سکتا ہے۔ وہ بہت مزے دار ہوتا ہے مگر مارے نفاست کے لوگ آم چوسنے سے گریز کرتے۔ اور عمدہ پھل سے محروم رہتے۔

پھر دھیرے دھیرے آم کی رونقیں ماند پڑنے لگتیں۔ کبھی کبھی دو چار آم کوئی بالٹی میں بھگو کے رکھ دیتا اور کھانے کے بعد وہی کھائے جاتے۔۔۔۔ اور تب آموں کی قدر اور بڑھ جاتی۔۔

ہمارا تو اب بھی وہی حال ہے چچا غالب والا۔۔" آم میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں"

☆☆☆

ہستیِ باکمال

(خاکہ)

ادیب الہندی

(مولانا مجتبیٰ علی خاں)

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ

آپ نے شاید دیکھے ہوں، مگر ایسے بھی تھے

مصنف مدّبر مفکر مذہبی رہنما۔ مولانا مجتبی علی خاں، ایک ایسی با کمال ہستی تھے جو برسوں میں پیدا ہوتی ہے۔

نام لیتے ہی آواز بھرّ انے لگتی ہے، قلم تھر تھرانے لگتا ہے۔ یہ ایک ایسا نام ہے جو ہر لمحہ دل سے لپٹا ہوا ہے۔ اب تو برس نکل گئے پر لگتا ہے ابھی کی بات ہے۔ ''سچ بتائیے کیا ہوا ہے''؟ ''کیا بتاؤں''؟ ایسے ہی گھومتے گھومتے دل بھر گیا تو پل بھر کو اسپتال میں ٹھہر گیا۔۔۔لکھنؤ سنجے گاندھی انسٹی ٹیوٹ والے بھیج رہے ہیں دہلی'' وہ ادھر فون پر ہنس رہے تھے۔۔کھوکھلی ہنسی۔۔پھر

ایک دن اچانک آ گئے۔ صبح صبح۔

''بتائیے۔۔دہلی کیوں آئے ہیں؟؟؟''

''بس یونہیں گھومنے۔۔۔تجھ سے لڑنے کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ صوفے پر لیٹے گھونٹ گھونٹ پانی پی رہے تھے۔ ۔۔۔قطب مینار نہیں دیکھا ہے ابھی تک' وہ میری باتوں کو ایسے ہی اڑا دیا کرتے تھے میں ان کی صورت دیکھ رہی تھی۔۔۔ایک دم کمزور ہو گئے تھے۔۔ چہرے ازلی چمک غائب تھی آنکھوں میں ایک انجانی تھکن اتر آئی تھی۔۔'' میں چائے کا پانی چڑھا کر واپس کمرے میں آئی۔۔ وہ سارے کمرے میں گھوم کر بچّوں کی تصویریں دیکھ رہے تھے۔ سارے کے سارے غایب ہیں۔۔۔''؟

''ہاں بھئی اسکول سے آتے ہی ہونگے تینوں۔۔گاجر کا حلوہ کھائینگے؟؟''

''ہاں۔۔جیو۔۔'' انھوں نے کود کر نعرہ لگایا۔ میں نے۔ باول لاکر رکھا اور تشتری لینے پھر باورچی خانے چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ صوفے پر آرام سے پالتھی مار کر بیٹھے تھے اور باول سے ہی کھانا شروع کر چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ جھوٹی تھی۔۔۔

کیا ہوا ہے؟؟ بتاتے کیوں نہیں؟؟'' میرے اندر اچانک خوف امنڈ آیا میں نے ان کا سر سینے سے لگا لیا۔۔۔اور وہ ساکت ہو گئے۔۔ وہ روئے نہیں آواز بھاری ہو گئی ''یار۔۔۔لوگ کہتے ہیں گردہ خراب ہو رہا ہے'' انھوں نے سر چھپائے چھپائے جواب دیا۔ گھبرانے کی بات نہیں۔۔'' میرا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔

جلدی سے اٹھ کر بیگ کھولا ایک کتاب مجھے دی اور ایک کیسٹ نکالا۔ میری طرف دیکھا میں پھٹی پھٹی نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔۔۔

''ارے ٹھیک ہو جاؤنگا۔۔مت گھبراؤ۔۔ ٹرانسپلانٹ ہو جائے گا نا؟؟ بالکل صحیح ہو

جاؤں گا۔۔''

''میرا اگر دہ لےلو بھیّا۔۔ٹھیک ہو جاؤ۔۔'' میری چیخیں نکلنے لگیں تھیں۔۔

ضرورت پڑی تو وہ بھی کرونگا۔۔اب پلیز میری بات تو سنو۔۔دیکھو اس کیسٹ میں کیا ہے۔۔'' کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور ایک کونے میں رکھا ٹیپ ریکارڈر اٹھا لائے۔ کیسٹ لگا دیا کمرے میں ایک غزل کے بول سرسرانے لگے۔۔آواز میری تھی۔

۔''یہ کب ٹیپ کی آپ نے۔۔'میں نے آنسو انھیں کی استین سے پونچھے۔

۔''دیکھا۔۔دیکھا'' وہ خوب خوش ہوئے۔

''یاد نہیں جب دو سال پہلے میرے پاس تھیں تو بچّوں کو غزل سنا رہی تھیں میں نے ٹیپ کر لی۔۔'' وہ اپنے کارنامے پر خوش تھے۔

غزل ختم ہوئی تو اٹھ کر کیسٹ نکالا اور اپنے بیگ میں ڈال لیا۔۔میں پھر رونے لگی۔۔

''آج مت جاؤ پلیز۔۔'' میں نے لاڈ سے گلے لگ کر کہا۔۔۔

''جانے دو۔۔ایک دوست بھی ہے ساتھ۔۔۔اب تو آتا رہونگا دہلی۔۔چکر لگتے رہیں گے۔۔۔میرا جانا مشکل مت کرو'' اپنی ہتھیلیوں سے میرے آنسو صاف کیئے اور بولے ''کھانا وانا نہیں کھلاؤ گی؟؟' میں نے باول پر نظر ڈالی سارا حلوا۔ویسا کا ویسا رکھا تھا۔'' کھایا کیوں نہیں؟؟'

''بس بھوک نہیں لگتی۔۔' وہ تھک کر لیٹ گئے۔کھانے کا اتنا شوقین میرا بھائی۔۔ایسی بات کہہ رہا تھا۔۔میرا دل چاہا اسپر قربان ہو جاؤں۔۔۔پھر کچھ دنوں بعد سنا کہ آپالو میں اڈمیٹ ہیں۔فون پر بات بھی ہوئی۔''کیا ہو گیا ہے؟؟؟ کیوں اسپتال میں ہیں آپ؟؟''

''یہاں کے ڈاکٹر بڑے مہربان ہیں۔۔اچھا لگتا ہے ان کے درمیان رہنا۔تم کب

آؤ گی ملنے؟؟'' وہ بات کرتے کرتے ہنس رہے تھے یہاں میری آنکھوں سے جھڑی لگی تھی۔
کس قدر ہر دل عزیز تھے۔۔کیرم کھیلتے تو خوب بے ایمانی کرتے اپنی گوٹیں پار کر دیتے۔۔اور ہم سب چلّاتے رہ جاتے۔کیرم کے بورڈ پر سجی ہوئی نو گوٹیں تھے ہم لوگ۔

۔وہ تو بہار تھے گھر کی۔۔

چاہے سردیاں ہوں یا گرمیاں برسات ہو یا کڑکتی دھوپ۔۔ان کے ساتھ زندگی ہمیشہ ست رنگی رہی۔۔۔آدھی رات کو اٹھ کر حلوہ کھانے کو دل چاہنے لگتا انکا۔۔چلو اٹھو سب۔۔حلوہ بناؤ بھوک لگی ہے۔آج میٹھی ٹکیاں کھانی ہیں۔۔۔بھینس کے دودھ کے پتیلے سے ساری بالائی اتار کر پیالہ بھر لیتے۔۔۔اور کسی کو ایک چمچہ نہ کھانے دیتے۔۔بچپن میں تو سب بتاتے ہیں کہ شکر کے بورے میں گھس جایا کرتے تھے۔۔اور بیٹھے شکر کھایا کرتے۔۔۔

صبح صبح سب کو اٹھا کر آنگن میں ہی کرکٹ شروع ہو جاتا۔۔کڑاکے کی سردی میں لحاف کھینچ کر اٹھا دیتے ''چلو چلو۔۔۔کھیل شروع ہو گیا ہے۔۔۔''

مجھے لگتا تھا کہ انھیں دیکھے بنا تو سورج بھی نہیں نکلے گا یکا یک سرسبز و شاداب ہنستا کھیلتا جسم یوں اندر سے ایک پرزہ ٹوٹ جانے سے تباہی کی طرف مائل ہو گا کسی نے سوچا بھی نہ تھا مگر سورج آج بھی نکلا ہے دھوپ کڑی ہے۔پتہ چلا گردے خراب ہو گئے ہیں۔۔سارے بہن بھائی گردہ دینے کے لیئے ٹسٹ کروا رہے ہیں۔۔۔میچ نہیں مل رہا۔۔۔ 18 برس کا بیٹا سامنے آ گیا۔۔۔''ڈاکٹر صاحب۔۔میرا ٹسٹ کر لیجئے۔۔میرے ابّو کو بچا لیجئے۔ نرم چہرے پر بیقراری رقم تھی۔۔۔وہ تو اولاد ہے۔۔۔یہاں تو غیر اسپتال کے باہر کھڑے ہیں قطار میں میں ان کے پاس بیٹھی تھی۔۔۔آنسو روکنا مشکل تھا۔۔۔بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ان کی ساری نسیں دکھائی دے رہی تھیں۔گول طباق سا چہرہ ایک دم پتلا اور کمزور ہو گیا تھا

۔''بچّوں کو بھی لے آتیں۔۔۔دیکھ لیتا۔۔۔ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔۔

۔''اپنگے نا بچّے۔۔گرمیوں کی چھٹیوں میں آپ کے پاس۔۔بہت دن رہیں گے

۔''اچھا۔۔''۔ سب کو پوچھ رہے تھے۔۔۔اپنی کمزور زرد انگلیوں سے میرے آنسو پوچھ دیے۔۔۔''ابھی۔۔تو مت روؤ۔۔''میری آنکھیں سوچ رہی ہیں کچھ ٹھیک سے دیکھائی بھی نہیں دے رہا ہے۔ان کا کھانا پینا کم ہو گیا۔پوچھا تو بولے۔۔

''اپنے حصّے کا کھا چکا ہوں''ہونٹوں پر پھر بھی مسکراہٹ قائم۔۔میں نے پلیٹ میں سر جھکا لیا۔۔لقمہ حلق میں اٹک رہا ہے۔

۔وہ کیسے تھے کیا تھے لکھونگی تو ورق کے ورق سیاہ کر دونگی۔۔۔اور پھر بھی بات پوری نہ ہوگی۔۔۔ایک عالم تھے۔۔۔سیکڑوں کتابوں کے مصنّف تھے۔۔کئی اسکول ان کی وجہ سے چلتے تھے۔۔کیا کیا لکھ سکتی ہوں؟ میں صرف جدائی لمحہ رقم کرتی ہوں۔وہ وقت بھی بیت گیا اور ابھی ایک فون آیا ہے۔۔۔سب ختم ہو گیا۔۔کچھ نہیں بچا۔

کیرم کا اسٹائیکر گم ہو گیا۔۔۔سارے کھیل رک گئے۔۔۔ یہ کسنے میرے پیروں میں انگارے باندھ دیئے ہیں۔۔۔میرے دل کے قریب آگ سلگ رہی ہے۔۔۔میرا پیارا میرا لاڈلا بھائی۔۔۔میرا ماں جایا۔۔۔سب کو ہراتا ہوا سب سے آگے نکل گیا ہے۔۔۔مگر مجھے لگتا ہے وہ ہر وقت آس پاس ہیں۔۔یہیں کہیں ہیں۔میرے قریب ہیں۔

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے

☆☆☆

صدائیں پیچھا کرتی ہیں

(خاکہ)

بابا کی یاد بہت آتی ہے، جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے ہمارے والد کے بڑے بھائی تھے ہمارا سارا بچپن ان کے سائے میں گزرا ان ہی کی ہدایتیں سن سن کر ہم بڑے ہوئے کتنی ساری باتیں ہیں جو اکثر یاد آتی ہیں تو ہونٹوں پر بابا کا ذہنی توازن صحیح نہیں تھا مگر ان کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچی ہے۔ بلکہ وہ خود ہی سب کے آرام کا بیحد خیال رکھتے تھے بابا کی شخصیت بہت پر اثر تھی جو بھی کبھی ایک بار ان سے مل لیتا وہ کبھی نہیں بھولتا تھا اچھا خاصہ لمبا سفید بال چھوٹی سی سفید داڑھی جو وہ ہر جمعہ کو خط بنواتے تھے، کپڑے پہنے کا بھی ان کا الگ انداز تھا، لائین یا چک والی لمبی قمیص اور چوڑے پائینچوں کا پائجامہ، سردیوں میں ایک گھر کی سلی واسکٹ پہنتے تھے جسے وہ ''بنڈی'' کہتے تھے اسمیں روئی بھری ہوتی تھی۔ سر پر اون کا بنا ہوا کیپ رہتا تھا جسے وہ ''ٹوپا کہتے تھے۔ بابا چہرے سے بیحد معصوم نظر آتے تھے کیونکہ ان کو دنیا داری بالکل نہیں آتی تھی جو کچھ بھی

کہتے یا کرتے تھے وہ سچ ہی ہوتا تھا۔

صبح صبح فجر کی نماز پڑھ کر جب وہ مسجد سے گھر آتے تو اپنے دامن میں ہارسنگھار کے بہت سارے پھول بھر کے لے آتے اور ہمارے سوتے ہوئے چہروں پر ٹھنڈے پھول برس جاتے چاروں طرف خوشبو پھیل جاتی، ہم ہڑبڑا کر اٹھتے تو وہ سرہانے اپنی معصوم سی مسکراہٹ لیئے کھڑے ہوتے، ''نماز پڑھ لیجئے بٹیا'' وہ نرمی سے کہتے ذہن کمزوری کے باوجود وہ ایک نارمل اور شریعت کی پابند زندگی گزار رہے تھے، نماز روزے کے لیئے وہ ہم پر کافی سختی بھی کرتے اور خود بھی کبھی لاپرواہی نہیں کرتے تھے مگر کبھی کسی بات پر غصہ آجاتا تو ایک رکعت نماز کے بعد اللہ میاں سے بھی خفا ہو جاتے۔ ''جاؤ نہیں پڑھتے...... کہہ کر مصلہ لپیٹ کر رکھ دیتے اور مسجد سے تیز تیز چلتے ہوئے کچھ بڑبڑاتے ہوئے نکل جاتے ہمیں نہیں پتہ چل سکا کہ وہ ناراض کیوں ہوتے تھے لیکن یقیناً کوئی دعا جو فوراً قبول نہ ہوئی ہو، اس پر انہیں بہت غصہ آتا تھا۔

قرآن کی تلاوت بھی روز پابندی سے کرتے اور اکثر باتوں میں آیات کوڈ کیا کرتے تھے مگر کبھی بھول بھی جایا کرتے اور غلط پڑھتے اور کسی کے صحیح کر دینے پر سخت ناراض ہوتے تھے۔ اشتعال جلدی آجاتا تھا شائد یہ ان کی کمزوری تھی پھر بڑی مشکل سے قابو میں آتے۔ اگر کوئی مہمان آجاتا تو بے انتہا خوش ہو جاتے،

''آگئے.......'' وہ ڈیوڑھی سے بڑی تیز رفتاری سے نمودار ہوتے.......''کون آگئے بابا؟؟؟؟؟ ہمیں تجسس ہوتا

''ارے وہی ان کے لڑکے........'' نام ذہن سے نکل چکا ہوتا

''کس کے لڑکے بابا؟؟؟؟؟؟'' گاؤں میں اوّل تو یوں بھی لوگ نہیں پہنچ پاتے تھے سوائے گرمیوں کی چھٹیوں کے اور ایسے کوئی آجائے تو بہت خوشی ہوتی تھی۔ بابا نام بھول جاتے مگر ہمیں ان کے انداز سے پتہ چل جاتا کہ ضرور پھوپی جان کے بیٹے ہونگے کیونکہ بابا ان لوگوں کے آنے سے بی

بے تحاشہ خوش ہوتے تھے محبت بھی بہت کرتے تھے اور ناراض بھی جلدی ہوتے۔ خیر اس وقت یا تو اندر انے والا اندر ہی آ جاتا یا پھر کوئی نوکر اطلاح لے کر آتا........(کیونکہ ہر ایک تو اندر نہیں بلایا جاتا تھا نا)

کوئی مہمان آ جائے تو بابا اسے جانے نہیں دیتے تھے زبردستی روک لیتے اور جب آنے والا دوسرے دن جانے کو تیار ہو تو خفا ہو جاتے

''کہ اتنی جلدی جانا تھا تو پھر آئے ہی کیوں'' اگر مہمان نہ مانتا تو اس کا سامان چھپا دیتے تھے ہم سبھی گھر ائے مہمان کا سامان ڈھونڈتے پریشان ہوتے اور بابا کھڑے کھڑے مسکراتے رہتے، کہتے 'اب جاؤ بیٹا........کیسے جاؤ گے........''

مہمان کی خاطر کرنا تو ہماری تہذیب میں شامل ہے مگر وہ اس جارہانا انداز میں خاطر مدارت کرتے کہ سب لوگ پریشان ہو جاتے، اگر مہمان نے کھانے سے ہاتھ روک لیا تو زبردستی اس کی پلیٹ بھر دیتے اور'' کیسے نہ کھیہو'' وہ غصہ میں پوربی بولنے لگتے

''چلو کھاؤ چپ چاپ'' غصہ میں اپنا کھانا چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے، ابّی سمجھاتے

''بڑے بھیّا آپ اپنا کھانا تو ختم کیجیئے'' مگر وہ غصہ میں کسی کی نہیں سنتے تھے۔

سارے عزیز، رشتہ دار ان کے اس عادت سے آگاہ تھے اس لیئے پہلے ہی ان کو کسی دوسری بات میں الجھا لیتے اور کوئی ایسا موضوع چھیڑ دیتے کہ ان کے ذہن سے خاطر کا خیال محو ہو جاتا اور مہمان اس جارہانا خاطر سے بچ جاتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں خاص طور پر ہمارے گھر میں رونق رہتی تھی، مہمانوں کی آمد زیادہ رہتی تھی کیونکہ ابّی کو آم کی دعوت کرنے کا بیحد شوق تھا، ان کے دوست احباب اور رشتہ داروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا ابّی کے اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے باغ میں بہار آ جاتی تھی طرح طرح کے آم اپنی بہار دکھاتے تھے کہیں ذرد آلو مہک رہا ہے تو کہیں لنگڑا نخرے دکھا رہا ہے، کہیں

لکھنؤ کا سفیدہ اور کہیں ملیحہ آبادی سفیدہ، چونسا اور کالا پہاڑ تو آخر میں آتے تھے مگر تب تک کافی لوگ گھر آ جاتے اور بہت رونق ہو جاتی، پوری آم کی فصل میں کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا تھا۔

ابّی اپنے ہاتھوں سے عمدہ عمدہ آم کاٹ کر کھلاتے، ایک مرتبہ ہمارے یہاں لکھنؤ کے ایک نواب صاحب تشریف لائے، بیحد نفیس طبعیت کے مالک تھے پروقار شخصیت، جسم بھاری، عمر کوئی ساٹھ پینسٹھ کے درمیان رہی ہوگی بہترین سفید ململ کا کرتا، پائجامہ شیروانی میں ملبوس، وہ ہمارے دور کے رشتہ دار بھی تھے اور پہلی بار ہمارے گھر آئے تھے۔

ان کے کھانے کا بھی خاص اہتمام کیا گیا تھا باہر کے تخت پر کھانا لگایا گیا کھانے کے درمیان کوئی بدمزگی نہیں ہوئی لیکن جب آم کی باری آئی اور ابّی اپنے ہاتھوں سے انھیں آم کھلانے بیٹھے تو ایک قاش لینے کے بعد انھوں نے 'بس جناب'' کہا اور اٹھنے لگے، ہمارے بابا کہاں تک برداشت کرتے........ بولے'' چپ چاپ کھائیے ابھی بہت آم ہیں'' نواب صاحب اس طرز تخاطب کے کہاں عادی تھے، حیران ہو کر بابا کو دیکھا پھر مروتاً ایک قاش اور لے لی۔ اس کے بعد وہ اٹھے تو بابا بھی کھڑے ہو گئے ملازم لوٹا سنبھال کر انکا ہاتھ دھلانے لگا تو بابا نے ڈانٹا،'' ابھی کیسے ہاتھ دھو رہے ہیں؟ آم کھائیے پہلے........''

وہ پلٹ کر مسکرائے اور بابا دیکھا پھر بولے'' جناب ہمارا معدہ اس قابل نہیں کہ........'' مگر بابا نے بات پوری نہ ہونے دی اور ایک آم کی گٹھلی لے کر ان کے پاس آ گئے........'' وہ گھبرا کر کبھی ابّی کو دیکھتے اور کبھی گٹھلی کو انھوں نے زندگی میں ایسی دعوت کبھی نہیں دیکھی تھی........ بابا ان کے پاس آ گئے تو وہ بھاگے........ بابا ان کے پیچھے دوڑے اب منظر یہ تھا کہ نواب صاحب آگے آگے اور بابا بڑی سی رسیلی گٹھلی لیئے پیچھے پیچھے۔ ابّی بابا کو آوازیں دیتے رہ گئے ۔'بڑے بھیّا........ سنئے تو........'' مگر بابا کہاں سنتے تھے وہ ان کو دوڑا رہے تھے ساتھ ہی ساتھ بولتے جا رہے تھے۔

''چلو........کھاؤ چپ چاپ........کھاؤ گے کیسے نہیں........'' نواب صاحب نے اب باقدئدہ چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا،

''ارے ضیغم صاحب بچائیے مجھے........'' وہ ابّی کو آوازیں دے رہے تھے، مگر بابا کو پکڑنا آسان نہیں تھا وہ اشتعال میں آ چکے تھے اور نواب صاحب کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے ان کے سفید کرتے کا برا حال کر چکے تھے۔ اب انہیں قابو میں نہیں کیا جا سکتا تھا سمجھایا مگر وہ سمجھنے کو تیار نہیں........نواب صاحب سے بھی بہت معذرت کی مگر وہ کچھ سنے کو تیار نہیں وہ اسی وقت جانے کے لیئے بضد تھے مگر نو بجے رات کو تب آدھی رات ہو جاتی تھی سواری کا انتظام کیونکر ہوتا۔ بہت مشکل سے انہیں سمجھا کر کپڑے وغیرہ بدلوائے گئے اور سلایا گیا، مگر وہ صبح ہوتے ہوتے ہی واپس چلے گئے اور پھر کبھی نہیں آئے۔

کچھ عزیز ایسے بے تکلف تھے جو اکثر آجایا کرتے ان کو گاؤں کی بیفکر زندگی بیحد پسند تھی، مگر وہ بابا کو پریشان کر دیتے تھے اس لیئے بابا کو ان کا آنا پسند نہیں تھا، بابا خوش تو بہت ہوتے مگر ان لوگون کے زیادہ رکنے سے گھبرا جاتے تھے ایک ایسے ہی صاحب تھے جو رشتہ دار ہونے کے ساتھ بھیّا کے بہت گہرے دوست بھی تھے، جو اکثر آجایا کرتے کافی دن رہ کر جاتے، اور پھر کچھ دن بعد دوبارہ آتے تو بابا کہتے ''پرکا گوڑ بھوسیلے ٹھاڑ........'' (جو جانور ایک بار کسی بھوسے والی جگہ پر بھوسا کھا لیتا ہے، بار بار وہیں آجاتا ہے) مگر وہ صاحب شرمندہ ہونے والوں میں نہیں تھے ہنستے رہے........اور بابا بھی ہنس دیے۔ مہاورے استعمال کرنے کا ان کو بیحد شوق تھا اور مہاورے کسی بھی زبان کے ہوں وہ ان میں پوربی زبان فٹ کر دیا کرتے، مثلاً کوئی بہت دیر تک ابّی کے پاس بیٹھا رہتا اور اندر ہم کھانے پر انتظار کر رہے ہوتے تو بابا کو بہت غصہ آتا کہتے

''منھ چڑھی ڈومنی گاوے تال بے تال، ٹھاکر مو کا موسی کہین۔ (منھ چڑھے لوگ الٹی سیدھی باتیں کر کے خوش ہو رہے ہیں کہ مالک نے ان کو منھ لگایا)

اگر ان کو یہ پتہ چلتا کہ کوئی کسی کی جائیداد پر قابض ہو رہا ہے تو بہت خفا ہوتے کہتے ''جھیگر بیٹھا بنیا کی جیب پر، گائے بجائے سب مورا ہے'' (جھینگر جب بنیا کی جیب پر بیٹھ جاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ جتنا بھی اس نے کمایا سب میرا ہے)

جب وہ کسی سے کوئی کام کہتے تو چاہتے کہ فوراً ہو جائے اگر وہ کوئی توجیہ پیش کرتا تو کہتے ''ناچے نا جانے انگنوا ٹیڑھ، کہوں انگنوٹیڑھ ہوت ہے ناچے کے گن چاہی'' (ناچ نا جانے آنگن ٹیڑھا کہیں آنگن بھی ٹیڑھا ہوتا ہے؟ ناچنے کا فن آنا چاہیئے) انھیں باتوں سے انہوں نے اپنی سونی زندگی میں رنگ بھر رکھا تھا

ایک بار ایک تحصیلدار صاحب ہمارے گھر آئے اتفاق سے اس دن کوئی نہیں تھا۔ ابی کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ سب لوگ باہر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے کھانا ہو چکا تھا اور کوئی پکانے والا بھی نہ تھا۔ بابا اندر جا کر انکے لیئے ایک گلاس میں دودھ لے آئے۔

ادھر ادھر کی باتوں میں دیوگاون کا ذکر نکلا (یہ گاوں فیض آباد ضلع کا ہے) کسی نے کہا کہ دیوگاوں ایسا نام ہے کہ اگر صبح یہ نام لے لیا جائے تو کھانا نہ ملے۔

اس پر تحصیل دار صاحب نے مڑ کر بابا سے کہا

اور جو بہار پور کا نام صبح صبح لے لیا جائے؟ اور سوالیہ نظروں سے بابا کو دیکھا

بابا نے بہت حاضر جوابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا

کچھ اور نہ ملے ایک گلاس دودھ تو مل ہی جاتا ہے

۔ باتیں اور بھی بہت ساری ہیں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں ہم سب سے انھیں بیحد محبت تھی، جب ہم چھوٹے تھے تو ہم سے کہتے کہ کھرپی لے کر لان کی گھاس کاٹو اور ہم سے نہ ہوتا تو بہت خفا ہوتے تھے کہتے ''سسرال جا کر کیا کروگی؟ سب کہیں گے کہ کسی نے گھاس کاٹنا بھی نہیں سکھایا؟

'' آخر عمر میں کافی بیمار رہنے لگے تھے۔ اتفاق سے ان دنوں میں ہی اکیلی تھی ابّی کے ساتھ گھر

میں۔ وہ دن بھی عجیب سا تھا ہر طرف سناٹا سا چھایا ہوا تھا، گرمیوں کی گھبرا دینے والی دوپہر تھی وہ
میں بابا کے لیئے دلیا بنا چکی تھی اپنے اور ابّی کے لیئے روٹیاں بنا رہی تھی جب بابا نے دالان سے
آواز دی، ''بٹیا''

''جی بابا''

''سر میں تھوڑا تیل لگا دیجئے'' وہ اپنا کام یونہیں لجاجت سے کہتے تھے۔'

'جی بابا........بس دو روٹیاں رہ گئی ہیں پکا کر آتی ہوں''

''اچھا'' بس یہ آخری آواز تھی جو میں نے سنی........مجھے کیا پتہ تھا وہ ورنہ میں فوراً بھاگ کے آتی۔
باورچی خانے سے نکل کر میں نے ہاتھ دھوئے اور سر اٹھا کر دالان کی طرف دیکھا وہ بالکل سیدھے
لیٹے ہوئے تھے اور ان کا ایک ہاتھ پلنگ سے نیچے لٹک رہا تھا، میں گھبرا کر دوڑی
''بابا........'' میں نے کئی آوازیں دیں پر انھوں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ میں نے بیقراری سے
ان کا ہاتھ تھام کر بستر پر رکھنے کی کوشش کی تو اف میرے اللہ........ ہاتھ بالکل ٹھنڈا تھا۔ میں
بھاگ کر ڈیوڑھی میں گئی دروازے کی زنجیر زور زور سے کھٹکھٹانے لگی ابّی بھاگتے ہوئے اندر آئے
انھوں نے بابا کو دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور باہر سے کئی لوگوں کو بُلا
لائے۔ بابا کے آخری سفر کی تیاّریاں شروع ہوگئیں۔

وہ دن اور وہ اندھیری شام جبکہ سب انھیں لے کر چلے گئے میں اکیلی پلنگ پر بیٹھی تھی
گاؤں ی عورتیں آ کر جا چکی تھیں، تنہائی کے وہ لمحات جب مجھے یاد آتے ہیں تو میرا دل ڈوبنے لگتا
ہے اس دن آسمان پر پورا چاند تھا، چاندنی میں چھت پر بنے ہوئے بابا کے کمرے کا عکس بھوت کی
طرح سیاہ تھا، لالٹین بھڑک بھڑک کر جل رہی تھی، جب میں تنہا ہوتی ہوں وہ شام میرے ساتھ
چلنے لگتی ہے تنہائیاں بہت ڈراتی ہیں، بابا بہت یاد آتے ہیں۔

☆☆☆

زیارت

(سفرنامہ)

ایک مدّت کے بعد دل کی حسرت پوری ہو رہی تھی، روحانی سفر شروع ہو چکا تھا۔

11 بجے دن کی فلائٹ سے روانہ ہوئے 7 بجے ہمارا ہوائی جہاز ریاض ایر پورٹ پر کھڑا تھا دو گھنٹے وہیں گزارنا تھے۔ دل کا عجیب عالم تھا، میرا بیٹا اسی سرزمین پر آرام کر رہا ہے۔ دل چاہتا تھا بھاگتی چلی جاؤں اور اس کا نشان ڈھونڈوں پر ممکن نہ تھا۔ اپنے ساتھیوں سے آنسو چھپائے رات ہوتے ہوتے مدینے پہونچے۔ ایر پورٹ پر بڑی مشکلوں سے پاسپورٹ ملے۔ ہم سبھی قطار میں زینوں پر بیٹھے تھے۔ یہ شہر مدینہ ہے۔ میں یہاں سانس لے رہی ہوں۔ کسی صورت یقین نہیں آتا تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہر طرف نیلی روشنی کا اجالا تھا۔ اک نیا احساس رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ ہم اس پاکیزہ سرزمین پر قدم رکھ چکے تھے۔ بس روانہ ہوئی تو پورے گروپ نے ''یا رسول اللہ'' کا نعرہ لگایا۔ اوراسی نعرے کی تکرار میں سفر تمام ہوا۔ مسجد نبوئی کے مینار نظر آرہے تھے۔ دل کا عجیب عالم تھا وہ کیفیت بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔

صبح سویرے ''یا اللہ'' کی آواز سے آنکھ کھلی۔ یہ کیا تھا۔؟ فجر کا وقت تھا نماز کے بعد بھی

یہ آواز سنائی دی۔۔ پوچھا تو معلوم ہوا۔ یہ ہمارے باورچی صاحب ہیں ان کا نام انتظار'' ہے۔۔ یہ ہر نماز کے وقت ایسے ہی آواز دینگے اس کے علاوہ چائے اور کھانے کے وقت بھی وہ یونہی پکارتے۔۔''یا اللہ'' تا کہ سب لوگ کھانے کے لئے اکٹھا ہو جائیں۔ بہت ہی پر لطف اور مہربان شخصیت کے مالک تھے۔ عمدہ کھانا پکاتے تھے۔ اور بہت اچھی چائے بناتے۔ مسجد نبوی کے لئے روانہ ہوئے۔ ہوٹل بہت قریب تھا اس لئے پیدل ہی چل پڑے۔

جنت البقیع کی جالیاں بہت قریب تھیں انھیں چھو کر یقین نہین آر ہا تھا کہ یہ میرے ہاتھ ان پاک جالیوں کو محسوس کر رہے ہیں۔

حبیب اللہ کی ریاست دیکھی۔ اپنے اپ کو اپنے ہونے کا احساس دلانا پڑا۔ دعائیں مانگتی رہی روتی رہی۔ عجیب احساس تھا جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں کی خوشبو اپنے اندر جذب کرتی رہی بس دل کا عجب عالم تھا۔

شام کو پھر وہیں پہونچ گئے۔ ٹھنڈا پر سکون ماحول۔ ننگے پاؤں۔۔ سرد سی لہر تھی جو ذہن ودل کو سکون بخش رہی تھی۔۔ بے پناہ مجمع اور ہم اسی مجمع میں گم۔ نمازیں تلاوتِ قرآن۔ اندر پہونچے تو دل کی دھڑکنیں بے قابو تھیں۔ بتایا گیا تھا کہ سبز قالین پر نماز کا بہت ثواب ہے۔ مجمع بے حساب۔ ایک ریلا تھا عورتوں کا جو بہائے لئے جارہا تھا۔ صرف چہرے نظر آرہے تھے سبز قالین کہاں تھا؟؟ اچانک عالم آرا نے مجھ سے کہا۔''نیچے دیکھیے آپ کہاں کھڑی ہیں'' دیکھا تو سبز قالین پر کھڑی تھی۔ نماز پڑھی مگر۔ سجدہ کرنا مشکل ہوگیا۔ کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ مگر کسی طرح نماز پوری ہوئی۔ اور باہر آئے۔ سب بچھڑ گئے تھے۔ سب کو ڈھونڈتے ہوئے رات کے 11 بج گئے۔ اب مجھے کچھ کچھ فکر ہونے لگی کہ ہوٹل کیسے جاؤں؟

باب عثمان سے باب علی تک کئی چکر لگائے، کوئی نہیں ملا۔ سڑک پر ائی تو ہوٹل بھول گئی

کدھر تھا۔ راستہ بھٹک چکی تھی۔ پھر ایک فرشتہ سفید کرتا پایجامہ پہنے اس سے احوال کہا اس نے ہوٹل کا کارڈ دیکھا اور مجھے ہوٹل چھوڑ گیا۔ بہت دعائیں دیں۔ اسے کمرے پر آئی تو سب تھے عالم آرا گم۔ یقیناً وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہونگی۔ میری بیحد عزیز دوست۔ اوپر جا کر ان کے شوہر کو بتایا۔ وہ سو رہے تھے جاگ گئے۔ 12 بج چکے ہیں ابتک عالم آرا نہیں پہونچی۔ وہ بڑے بزلہ سنج نکلے۔ بولے" آپ سوجائے وہ آجائیگی۔ میں ڈھونڈنے نہیں جاؤنگا ورنہ میں بھی کھو جاؤنگا" میں خاموشی سے چلی آئی۔ بعد میں پتہ لگا کہ گئے تھے۔ مگر عالم آرا پہلے ہی آگئیں۔ مینے پوچھا کیسے آئیں؟ بولیں۔"ایک صاحب سفید کرتا پائجامہ پہنے ہوئے ملے، اور ہوٹل تک چھوڑ گئے۔ اللہ جانے وہ کون تھے؟ دونوں ایک ہی یا الگ الگ؟

☆☆☆

چلتی رہے زندگی۔۔

(سفرنامہ)

میں نے پہلا پاؤں بادلوں پر رکھ دیا۔۔۔ایک نرم سی ٹھنڈک میرے اندر اتر آئی۔۔ایک خوبصورت احساس سارے وجود میں تیرنے لگا۔۔۔نرم سفید خنک بادل۔۔۔وہ ایک خوبصورت شام تھی جب میں نے حیدرآباد میں قدم رکھا۔۔۔

دنیا کے کئی شہر دیکھے،سعودی عرب کا شہر ریاض،امریکہ کا شہر شکاگو،انگلنڈ کا شہر لندن۔۔۔۔ایران کا شہر تہران۔۔۔مگر اپنے ملک کا اتنا خوبصورت شہر پہلی بار دیکھا۔۔

برسات کا موسم شروع ہورہا تھا ہر طرف بادلوں کی دھند چھائی ہوئی تھی۔۔۔اور میں چل پڑی تھی ایک لمبی سیر کے لئے حیدرآباد کی سمت۔۔۔۔وہ حیدرآباد جس کے بارے میں صرف سنا تھا یا پڑھا تھا۔۔نظام حیدرآباد کی لائبیر ئری کے بارے میں،حسین ساگر کے بارے میں اوران شفّاف موتیوں کے بارے میں۔۔۔اور میں سوچ رہی تھی یہ سب کچھ قریب سے دیکھنا کتنا روح پرور ہوگا۔۔۔

سب سے پہلے ہم حسین ساگر دیکھنے گئے یہ ایک خوبصورت جھیل ہے جو چاروں طرف

شہر سے گھری ہوئی ہے،اس کے درمیان گوتم بدھ کا بلند مجسمہ استادہ ہے۔۔۔ایک طرف لبنی باغ جہاں سبزہ کاٹ کر درمیان سے سڑک نکالی گئی ہے،ایک طرف بچوں کا پارک۔۔جہاں ایک چھوٹی سی ٹرین چلتی رہتی ہے۔۔جھیل میں مستقل کشتیاں رواں دواں تھیں۔۔۔ہم نے کشتی کا ٹکٹ لیا اور روانہ ہوئے۔۔۔چند لمحوں کے سفر کے بعد ہم گوتم بدھ کے مجسّمہ کے قریب پہونچ گئے، جو کہ اک ماہر نقاش نے تراشا ہے،طویل القامت مجسمّہ پانی کے درمیان کھڑا مسکرا کر سب کو دعائیں دیتا دکھائی دیا۔آس پاس خوبصورت فوّاروں سے پانی رواں تھا۔۔۔وہاں سبزے پر کئی لوگ بیٹھے نظر آئے دل کے سکون کے لئے بہترین جگہ تھی یہاں فضا بڑی پرسکون اور خاموشی طاری تھی۔

دوسرے دن ہم لوگ سالار جنگ میوزیم پہونچے۔۔

اس میوزیم کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ کم پڑ گئے ہیں۔۔اس عمارت میں ایک پوری دنیا آباد ہے اندر داخل ہوتے ہی احساس ہوا کہ ہم ایک خوبصورت صدی میں آگئے ہیں۔

میوزیم کا رقبہ کافی طویل تھا یہ ایک دن میں نہیں دیکھا جا سکتا تھا

یہ یقیناً ایک محل رہا ہوگا۔۔۔بے شمار ہال،طویل راہداریاں بیچ بیچ میں صحن جن میں طرح طرح کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے ہر طرف سبزہ پھیلا ہوا تھا۔۔ایک صحن کے سرے پر ایک قدِ آدم ٹی۔وی لگا ہوا تھا اس پر ڈرامے نشر کئے جا رہے تھے اکثر لوگ وہیں کرسیوں پر بیٹھے محویت سے پروگرام دیکھ رہے تھے۔۔مگر ہم وہاں نہیں رک سکے کیونکہ وہاں بے شمار چیزیں ایسی تھیں جن کی کشش ہمیں کھینچے لئے جا رہی تھی۔

روغنی تصویریں ،چینی کے حسین پھولدار ظروف ،سنگِ مرمر کے حسین ترین مجسّمہ۔ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ایک کمرے میں گھڑیوں کا زخیرہ تھا مختلف انداز اور

مختلف زمانوں کی بے شمار گھڑیاں وہاں رکھّی ہوئی تھیں کہیں چینی کے فرشتے وقت اپنی پیٹھ پر اٹھائے کھڑے تھےاور کہیں کانسے کے جوکر وقت کواپنے پیٹ پرسجائے کھڑے تھے۔۔۔۔وہاں ایک بہت بڑا ہال تھا جو شاید ڈرائینگ روم کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔۔ ہرطرف خوبصورے صوفے لگے تھے اس کا رقبہ تقریباً 50/50 گز ہوگا چاروں طرف دیواروں پر عمدہ اور قیمتی تصویریں تھیں۔۔ بلکہ پینٹنگس کہنا زیادہ مناسب ہوگا ،،ان میں مونا لیزا کی تاریخی پینٹنگ بھی مسکرا رہی رہی۔۔اس کے علاوہ بھی کئی تاریخی تصویرین تھیں جن کے بارے میں ان کے نیچے تاریخ درج تھی۔درمیان میں جولکڑی کی منقّش میز رکھّی تھی اس پر بہترین کرسٹل کی شطرنج موجود تھی،جس کے اوپر ننھے ننھے مہرے بھی کرسٹل کے بنے ہوئے تھے۔ ہال کے آخری سرے پرایک کانسے کا مجسمہ استادہ تھااور وہ ڈبل تھامیں شاید سمجھا نہ سکوں۔۔لیکن وہ عجیب وغریب مجسمہ تھاایک طرف ایک سپاہی بڑی سی تلوار لئے زرہ بکتر پہنے ہوئے ہوئے تنا ہوا کھڑا تھااس کے دوسری طرف ایک بڑا آیئنہ لگا ہوا تھا۔۔اور وہی مجسمہ دوسری طرف سے دیکھئے تو ایک نازک اندام دوشیزہ گھونگھٹ میں سلام کے لئے جھکی نظر آرہی تھی۔۔۔جس نے پیشواز پہنی ہوئی تھی۔۔۔اور اپنی مخروطی انگلیوں سے پیشواز کا دامن تھا ما ہوا تھا۔حیرت حیرت۔۔۔۔اور صرف حیرت۔۔ایک کمرے میں صرف برتن تھےجن میں چاندی سونے سے لے کرچینی کانسے اور مٹّی تک کے برتن سجے ہوئے تھے۔۔چینی کی پیالیوں اور طشتریوں پر فارسی میں اشعار لکھے ہوئے تھے۔۔۔پلیٹوں میں فارسی کے قطعات موجود تھے۔چاندی کے کانٹوں چمچوں پر مہارت سے نظام حیدرآباد کے نام کندرہ تھے۔

اب حقّوں کی باری آئی تو دیکھا چینی کے کانچ کے چاندی کے ہرطرح کے حقّے سجے ہوئے تھے،ان کے پیندوں پر اشعار کندہ تھے

چاندی کی نئے اور کانچ اتنا ہلکا جیسے چاندی کا ورق۔۔۔حقّوں کے ساتھ ساتھ پائپ بھی سجے ہوئے تھے طرح طرح کے ڈیزائین،طرح طرح کے مڑ دیل۔۔۔ہاتھی دانت کے پائپ بھی موجود تھے اور کانچ کے بھی۔۔لکڑی کے بے شمار۔۔۔ان پر مہارت سے نقاشی کی گئی تھی،بیل بوٹے بنائے گئے تھے،سائیز بھی الگ الگ موجود تھے۔

پوری دنیا کے آرٹ کے نمونے وہاں موجود تھے،اکثر نقل بھی تھے مگر ایسے کہ ان پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔

ایک بہت بڑا ہال کتابوں سے سجا ہوا تھا جہاں اردو فارسی عربی کے قلمی نسخے موجود تھے سراج دکنی ،اور ولی دکنی کے دیوان سجے ہوئے تھے کچھ کتابیں نظام حیدرآباد کی لکھی ہوئی تھیں۔ہر قسم کے رسم الخط موجود تھے۔قران پاک کی تفسیر قلم اور روشنائی سے لکھی ہوئی۔۔

پوری دنیا کے آرٹ کے نمونے سجے ہوئے تھے۔

ایک چیز کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گی جسے میں آج تک بھول نہ سکی۔وہ ایک مجسّمہ ہے جو کہ فرانس کے ایک ماہر نقّاش نے تراشا ہے،یہ ایک قدِ آدم مجسمہ جو کہ ابراہیم علہیہ سلام کی بہو "ربیکا" کا ہے

سفید اور شفّاف بالکل جیتا جاگتا سا محسوس ہوتا ہے اس مجسّمے کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے جسم پر ایک ہلکا سا دوپٹہ پڑا ہوا ہے۔۔اور وہ بھی سنگِ مرمر سے تراشا ہوا۔۔۔

ماتھے سے ہونٹوں تک آتے آتے اس دوپٹہّ کی شکنیں اتنی واضح اور حیران کن ہیں کہ جو دیکھتا ہے وہ مبہوت رہ جاتا ہے۔وہ کپڑا کمر سے نیچے تک جاتا ہے اور جھالرسی بن جاتی ہے ،،وہ حصّہ بھی سنگِ مرمر سے بنا ہوا ہے وہ جھالریں پیر کی ایڑیوں تک آتی ہیں اور پیروں میں سینڈل بھی خوبصورتی سے تراش کر بنائی گئی ہے اس بے مثال مجسّمہ کی تاریخ بھی میں لکھ کر لائی تھی جو مضمون کی طوالت کے پیش نظر ابھی نہیں لکھ رہی ہوں۔انشاء اللہ آئیندہ رقم کروں گی۔۔کمپنی

باغ کی طرح ایٹ اسٹریٹ بھی حسین ساگر کا ایک کنارہ ہے، جس پر خوبصورتی سے ٹورسٹ کے بیٹھنے اور کھانے پینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ رنگ برنگی کرسیاں ،سفید جالی کے کنارے نصف دائیرے کی شکل میں لگی ہوئی تھیں۔ اور یہ حصہ حسین ساگر کو چھو رہا تھا لوگ سیڑھیوں پر پانی میں پیر ڈالے بیٹھے تھے۔۔ دوسری طرف کی روشنیوں کا عکس پانی میں جھلملا رہا تھا۔۔ اور وہ منظر اتنا حسین تھا کہ جو میں بیان نہیں کرسکتی مگر آپ محسوس کر سکتے ہیں۔

میں اور میری بیٹی کافی لے کر وہاں بیٹھ گئے اور کنارے پر جلتی بجھتی روشنیوں کا جادو دیکھتے رہے۔ اور پھر رات اتر آئی۔

حیدرآباد سنٹرل مال بھی بیحد خوبصورت ہے مگر اب تو ہر جگہ ایک سے ایک عمدہ مال بن گئے ہیں اس لئے اس کا ذکر نہیں کروں گی۔۔ مگر وہاں جو جولری کی دو کانیں تھیں وہ اس قدر حسین تھیں، قطار سے سچے موتیوں کی لائینیں لگی ہوئی تھیں۔۔ اتنے سارے موتی میں نے ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھے تھے۔۔۔ ایک خوبصورت سجی ہوئی شاپ میں ایک کرسٹل کے بڑے سے پیالے میں سچے موتی بھرے ہوئے رکھّے تھے۔۔۔۔ وہ میں اب تک نہیں بھول سکی۔۔۔

اس دن صبح صبح بیٹی نے جگایا۔۔۔ اور بتایا کہ ہم "راموجی فلم سٹی" دیکھنے جا رہے ہیں۔ 9 بجے بس وہاں سے روانہ ہوئی دور دور تک سیاہ پہاڑیاں اور حدِّ نگاہ تک سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم اس علاقے میں داخل ہوئے جہاں ایک اونچی پہاڑی پر دور سے "راموجی فلم سٹی" کا مخفف آر۔ ایف۔ سی۔ نظر آ رہا تھا۔

ہماری بس نہایت آرام دہ تھی اور میری بیٹی فارینا نے بس کے ٹکٹ لیتے وقت فلم سٹی کا ٹکٹ بھی لے لیا تھا اس لئے ہمیں کسی لائین میں نہیں لگنا تھا۔۔۔ آرام سے دوسری کھلی ہوئی بس میں بیٹھ کر آگے بڑھ گئے۔ وہ سرخ رنگ کی کھلی کھلی سی بسیں تھیں جو ہمیں پورا فلم سٹی گھمانے والی

تھیں۔وہ بسیں نہایت آرام دہ، جیسے ہم صوفے پر بیٹھے ہوں اور اوپر سرخ چادرتنی ہو۔۔۔۔ہر طرف سے پورا علاقہ نظر آرہا تھا۔۔سرسبز و شاداب۔۔۔ایک گائیڈ نے ہمیں تاریخ بتانا شروع کی ،وہاں پر کئی مغلیہ محلوں کی نقل بنی ہوئی تھی ان محلوں میں فلم کی شوٹنگ ہوتی ہے اور ہمیں نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔۔۔ویسے تو وہاں بہت ساری چیزیں قابلِ ذکر ہیں ایک ریستوراں مجھے بیحد پسند آیا جہاں بیرے مغلیہ دور کی سر پر پگڑی اور سفید پیشواز پہن کر کھانا سرو کر رہے تھے،کھانے کی پلیٹیں اور گلاس چاندی کے تھے کھانے میں بھی بہت ذائقہ تھا۔۔۔ہم دونوں نے خوب کھانا کھایا اور آئس کریم بھی۔۔

بڑی بڑی سفید سیپیاں بنا کر اس میں سرخ پھول ،سفید ،نارنجی ، پھول لگائے گئے تھے۔۔۔چاروں طرف بے حد سجاوٹ تھی۔

☆☆☆

افسانوں پر مختلف آراء

کہانی کا بیان اور کہانی کی بنت دونوں افسانہ نگاری پر افسانہ نگار کی قدرت کا مظہر ہیں لیکن کہانی وہیں ختم ہوگئی تھی جہاں پرویز جیسا کردار اسی گھر سے نکل آتا ہے جہاں گناہوں کا بسیرا ہے-لیکن" تبھی ولائت شاہ نے غرا کر پکارا
شہروز میاں"!
.جی ابّا---"وہ سعادت مندی سے جھکے
"اس بار پرویز کو بھی حج کرواؤ---!"
(پیغام آفاقی -افسانہ لبیک)

آپ کے افسانے پڑھتے ہوئے ہمیشہ زبان و بیان کی چاشنی میں کھو جاتا ہوں- زیرِنظر افسانے میں بھی بڑی پیاری زبان برتی گئی ہے، پھر یہ ہے کہ بہت بے ساختہ پن ہے تحریر میں-- کہیں بناوٹ نہیں- جیتے جاگتے ہمارے اردگرد کے کردار دکھائے گئے ہیں، کہانی بھی خوب ہے، اور انجام تو انتہائی عمدہ- دراصل اس افسانے کا آخری جملہ میں ہی اس افسانے کی جان ہے-
(وحید قمر-افسانہ لبیک)

بہت ہی عمدہ کہانی.. دین اور دنیا کو برتنا.. امیروں کو ہی آتا ہے.. غریب تو بس زبان پر اعتبار کر بیٹھتا ہے. بہت ہی خوبصورت کردار نگاری

بیانیہ بھی خوب! کہانی گو کہ پرانی ہے مگر انداز اچھا لگا.
خاص طور پر آخری جملہ "
شہروز میاں"!
جی ابّا۔۔۔"وہ سعادت مندی سے جھکے
"اس بار پرویز کو بھی حج کرواؤ۔۔!"
(فرحین جمال۔افسانہ لبیک)

ارے انجم کیا شاندار افسانہ ہے واااااہ مزہ آ گیا......! پوربی زبان کا چٹخارہ، رواں اسلوب اور جاندار مکالموں کیساتھ ایک مقصدی افسانہ جس میں مقصد فن پر حاوی نہیں! ہندوستان میں بہت جگہوں پر ہندو مسلمان ایک دوسرے کے تیوہاروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں-محرم کے جلوس یا کئی جگہ مزاروں پر عرس وغیرہ کے موقعہ پر زائرین کیلیے سبیلیں لگا کر ہمارے ہندو بھائی اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح دسہرے، ہولی دیوالی وغیرہ پر مسلمان بھائی بھی اپنی بھر پور حاضری سے اس گنگا جمنی تہذیب کو بنا کر رکھتے ہیں ....مذکورہ افسانے کا اختتام بھی اسی صحت مند گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے، اپنی سیاست چمکانے کے لیے کچھ شر پسند عناصر داؤ پیچ دکھا کر ماحول میں زہر گھولنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں کئی بار کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن زیادہ بار ناکام ہی ہوتے ہیں تبھی تو ایسے افسانے جنم لیتے ہیں! پیاری دوست بہت داد اس زبردست افسانے کے لیے!

(افشاں ملک۔افسانہ)

تالانگری میں کہانی سنانے والی, سنہری روایت دھڑکن کا نام انجم قدوائی ہے-ان کے یہاں قلم تحریر رومانیت سے پیچھا چھڑاتی ہوئی, ہمیشہ حقیقت کی طرف گامزن رہی ہے-کہانی جب بھی کسی ماں کی قلم سے بیان ہوتی ہے وہ ہر عہد میں سفر کرتی ہے-زندگی کے مختلف ادوار کو، ٹوٹتی بکھرتی سنہری روایت/ روایتوں کے سلسلوں کو" آج" کی برق رفتار زندگی سے جوڑ کر کہانی بننے کا ہنر آپ کو خوب آتا ہے-

کہانی زمین پر دیے یوں ہی جلا ئیر کھیو-----
دھیمے سروں میں کہانی سنانے والی انجم قدوائی صاحبہ آپ سلامت رہیں–آمین۔
(خورشید حیات صاحب۔افسانہ)

اس افسانے میں محبت کے جس عالمگیر انسانی عنصر کو انجم نے اپنے تحریر میں سمویا ہے اسکا پیغام ا? فاقی ہے۔انجم نے فلسفہ محبت کے تحت سوئی ہوئی دینا کو جگا کر حسین سے تمام مذاہب کے لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ "ہمارے ہیں حسین"۔۔۔

(سید صداقت حسین۔افسانہ)